PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۳۷ شمارہ : ۹

ستمبر ۲۰۱۶ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

''زبان و ادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

PDF Compressor Free Version

ترتیب

اداریہ	حرفِ آغاز		مدیر	۳
مقالات	قرۃ العین حیدر کی افسانوی کائنات		مشرف عالم ذوقی	۵
	عبدالصمد کی کہانی ''ہونی اَن ہونی'' پر تاثراتی گفتگو		انجم عثمانی	۸
	شکیلا اختر کے سو برس		عظیم اقبال	۱۰
	سیاست میں ادب کے سفیر: ڈاکٹر سید احمد		ڈاکٹر سید احمد قادری	۱۵
	تمل ناڈو میں اردو		ڈاکٹر جاویدہ حبیب	۱۷
	اردو کے چند غزل گو شعرا: بخطِ خویش		محمد سمیع احمد	۲۱
	زبان: فطری ارتقا اور ادعامی اثرات		ڈاکٹر محمد بشیر الدین	۲۵
	منٹو کی فنکارانہ عظمت		حسن جہاں	۲۸
افسانے	نرم لہجے کا فسوں		فیروز عابد	۳۱
	قرابت دار		بلراج بخشی	۳۴
	دستخط		رابعہ الرباء	۴۱
	وقت کا سحر		کہکشاں انجم	۴۶
طنز و مزاح	غالب کی سیاسی شاعری		شاہ فیاض عالم ولی اللّٰہی	۴۷
منظومات	تضاد		ابوالخیر نشتر	۴۹
	رنگ طلسمات		شاہد اختر	۵۰
	نقادِ اعظم		اسرار جامعی	۵۱
	زندگی اور سیاست کے نام کچھ نظمیں		ساحر داؤد نگری	۵۲
	غزل		شفیع احمد فاطمی	۵۳
	غزلیں		پروفیسر راشد طراز	۵۴
	غزلیں		حیرت فرخ آبادی	۵۵
	غزلیں		شمیم قاسمی	۵۶
	غزلیں		محمد شاہد پیٹھان	۵۷
	غزلیں		تنویر اختر	۵۸
کتابوں کی دنیا	غبارِ فکر	سالم شجاع انصاری	مبصر: حسن نواب حسن	۵۹
	خانوادہ سیدہ زینب.....	مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری	مبصر: مولانا محمد عالم قاسمی	۶۱
	ڈھلان پر رکے لوگ	غیاث اکمل	مبصر: ڈاکٹر کلیم اختر	۶۲
	آئینہ آج کا	سلطان آزاد	مبصر: ڈاکٹر محمد اسد اللہ	۶۴
ادبی سرگرمیاں	اردو مشاورتی کمیٹی کی اہم نشست راکادمی میں پرچم کشائی			۶۶
سلام و پیام	علیم صبا نویدی، کرشن بھاوک، ڈاکٹر محمد صلاح الدین، فردوس گیاوی، شکیل سہسرامی، نورالہدیٰ شمسی، ڈاکٹر سید اشرف اسمٰعیل صادق پوری، احد پرکاش، شمس فریدی، صادق علی انصاری، ارمان نجمی			۶۷

بچوں کا زبان و ادب

۷۳ — ۸۰

PDF Compressor Free Version

اداریہ

حرف آغاز

مجھے اکادمی جوائن کئے سال بھر ہو گئے۔ سوچا، سال بھر میں، میں نے کون سے تیر مار لئے؟ اس کا جائزہ لیتا چلوں۔ میں نے آتے ہی محسوس کیا کہ اکادمی کا سمینار ہال بڑی بے بسی سے میری جانب تک رہا ہے۔ لکڑی کے منچ پر چڑھتے ہوئے بارہا ادیب پشت کے بل گر جایا کرتے تھے۔ میں نے پہلے سے ڈیڑھ گونہ بڑے، پختہ منچ کی تعمیر کرائی۔ پورے ہال میں پردے لگوائے، ہال کو اے سی سے مزین کیا۔ نئے پوڈیم کے ساتھ منچ کے لئے نیا ٹیبل بنا۔ اچھی کرسیاں لی گئیں اور نئے قسم کے ساؤنڈ سسٹم کا اہتمام کیا گیا۔ ساتھ ہی پورے ہال کو انورٹر کی سہولت فراہم کرائی گئی تاکہ بجلی کے جانے کے بعد بغیر کسی پریشانی کے پروگرام چلتا رہے۔ اسٹیج کے بغل میں ایک باتھ روم کی بھی تعمیر کرائی گئی تاکہ شرکا و سامعین کو آسانی فراہم ہو سکے۔ اب وہی خستہ حال سمینار ہال ہر طرح سے مزین ہو کر لوگوں کی نگاہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تخلیق پر جو اعزازیہ ملتا تھا، وہ بہت ناکافی تھا اس میں دوگنی رقم کا اضافہ کیا گیا۔ ایوارڈ کی سب سے بڑی رقم صرف اکیاون ہزار تھی جو اب سب سے چھوٹی رقم ہو گئی ہے۔ ایک لاکھ اکیاون ہزار کے دو ایوارڈ، ایک لاکھ ایک ہزار کے تین ایوارڈ اور اکیاون ہزار کے بیس ایوارڈ دینے کا فیصلہ کمیٹی کرتی ہے۔ الحمدللہ میں نے ۲۰۱۴ء اور ۲۰۱۵ء کے ایوارڈ کی تقسیم کرا دی ہے۔

اردو اکادمی نے اپنا ایک بہت اہم اور تاریخ ساز پروگرام ''اکادمی آپ تک'' شروع کیا ہے جس کی پزیرائی ہندوستان میں ہی نہیں بیرون ملک میں بھی ہو رہی ہے۔ دراصل یہ پروگرام بہار کی سطح پر، ہر ضلع میں پہونچ کر وہاں کے ان بزرگ ادیبوں اور شاعروں کی پزیرائی کا پروگرام ہے جو زندگی بھر ادب کی خدمت تو کرتے ہیں، لیکن کسی بھی ادبی ادارے کے ایوارڈ سے محروم رہتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم ہر ضلع میں ان بزرگ ادیبوں تک رسائی حاصل کریں جن کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس پروگرام میں ہر ضلع سے تین بزرگ ادبا و شعرا کا انتخاب کیا جاتا ہے اور ان کے ضلع میں پہونچ کر ہم انہیں نوازتے ہیں۔ ان کی خدمت میں ایک خطیر رقم کے علاوہ سند، مومنٹو اور شال بھی پیش کی جاتی ہے ساتھ ہی ان کے فن پر مقالے پڑھے جاتے ہیں اور ان کے فن اور شخصیت کا محاسبہ کرتے ہوئے تقریر بھی کرائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس ضلع کے شعرا پر مشتمل مشاعرہ بھی کیا جاتا ہے اور شعرا کو اعزازیہ کے طور پر اکادمی سے رقم بھی دی جاتی ہے۔ ابھی تک اکادمی نے گیا، دربھنگ، بتیا، بیگوسرائے اور مظفر پور میں اس پروگرام کو انجام دیا ہے اور اس سال ہم نے دس ضلعوں تک پہونچنے کا ہدف بنا رکھا ہے۔

میرے ذہن میں بہت پہلے سے یہ بات گشت کر رہی تھی کہ ہماری آدھی آبادی خواتین پر مشتمل ہے اور ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار نے اس آدھی آبادی کے لئے بہت کام کیا ہے۔ بچیوں کی تعلیم سے لے کر، بلدیاتی چناؤ میں خواتین کے ریزرویشن تک عورتوں کی بہبود کے لئے کافی توجہ دی ہے اور اب تو سرکاری نوکریوں میں بھی ان کے حصے کو مخصوص کر دیا گیا ہے تو کیوں نہیں، خواتین ادبا و شعرا پر مشتمل ایک ایسا پروگرام مرتب کیا جائے جس میں صرف خواتین قلم کار ہی حصہ لیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ ہم نے سہ روزہ خواتین کنونشن کا انعقاد کیا جس میں ملک کے ہر گوشے سے خواتین قلم کاروں نے حصہ لیا اور پچاس خواتین پر مشتمل یہ پروگرام تین دنوں تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا اور آخر میں ان پر مشتمل ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ انشاءاللہ ہماری کوشش ہوگی کہ ہر سال ایسا پروگرام ضرور منعقد کیا جائے۔

اکادمی نے پہلی بار عالمی اردو کانفرنس کا بھی کامیاب انعقاد کیا جس میں ملک کے اہم شرکا کے علاوہ، کناڈا، ترکی، ایران، قطر اور ماریشش کے قلم کاروں نے حصہ لے کر پروگرام کو کامیاب بنایا۔

اردو صحافت کو میں اردو ادب سے جوڑ کر ہی دیکھتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں نے قومی سطح کا دو روزہ صحافتی پروگرام منعقد کرایا جس میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے صحافیوں کے علاوہ ہمارے صوبے کے صحافیوں نے بھی شامل ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صحافت کے سلسلے میں اکادمی کا ارادہ ایک دو دن کا ورک شاپ

PDF Compressor Free Version

بھی کرانے کا ہے اور یہ ورک شاپ تواتر سے ہوتا رہے گا جس سے نئے صحافیوں کی تربیت بھی ہوتی رہے گی۔

ہم نے آتے ہی ایک کوشش یہ کی کہ عظیم آباد کے سبھی شعرا پر مشتمل مشاعرے کا انعقاد کیا جس میں مختلف عمر کے ایک سو شعرا نے شرکت فرمائی اور ان سارے پروگرام کی ویڈیو گرافی بھی کرائی گئی جو ہمارے ڈیجیٹل آرکائیوز کا حصہ ہے۔ کوئی چاہے تو سو سال بعد بھی اکادمی کے یہ سارے پروگرام ہمارے آرکائیوز میں آکر من وعن دیکھ سکے گا، اس سے ہماری ایک تہذیبی وراثت محفوظ ہو جائے گی۔ اکادمی آئے دن توسیعی خطبات کا بھی پروگرام رکھتی ہے جس میں کسی بھی بڑی ادبی شخصیت کے احوال اور ان کے فکر وفن کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہم نے یونیورسٹی کے بچوں پر مشتمل بیت بازی کا بھی پروگرام کرایا جو کبھی ہماری تہذیب کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ لوگوں نے اسے بے حد پسند کیا اور کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ بیت بازی، مشاعرے سے زیادہ بہتر پروگرام ہے۔ ''زبان وادب'' کا شمارہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ صوری اور معنوی اعتبار سے ہر شمارہ اپنے گزشتہ شمارے سے بہتر ہوتا ہے۔ قارئین کی توجہ نے اس کی اشاعت پر بھی مثبت اثر ڈالا۔ اب اس کی اشاعت ڈیڑھ گونہ بڑھ گئی ہے۔

پہلے کتابوں پر اوّل انعام کی رقم دس ہزار روپے تھی، لیکن اب تیسرا انعام دس ہزار روپے ہے۔ دوسرا انعام پندرہ ہزار اور اوّل انعام اکیس ہزار روپے کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح مسودے کی اشاعت کے لئے بھی رقم میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کالج، انجمن اور سوسائٹیز کو پروگرام کرانے کے لئے بھی ایک لاکھ روپے تک کا مالی تعاون دیا جاتا ہے۔ لائبریریوں کی بھی کتابوں کے ساتھ مالی اعانت کی جاتی ہے۔ بہار کی سطح پر جو معذور شعرا وادبا ہیں، انہیں بھی خطیر رقم دے کر ان کے علاج پر توجہ دی جاتی ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر بھی اردو آنرز اور ایم اے کے ٹاپرس کو اعزازیہ دے کر اکادمی ان کے حوصلے بڑھاتی ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم اکادمی کے مخلصین کے مشوروں کا بھی احترام کریں تاکہ اکادمی بہتر کارکردگی کر سکے۔ ہمیں آپ کے مشوروں کا بھی انتظار رہتا ہے تاکہ ''زبان وادب'' کے معیار میں دن بہ دن اضافہ کیا جا سکے۔ انشاء اللہ عنقریب ہی ہم اکادمی کے ''خبرنامہ'' کو پھر سے جاری کرنے جا رہے ہیں اور ہماری کوشش یہ بھی ہوگی کہ ''بچوں کے زبان وادب'' کو بھی الگ سے شائع کیا جائے۔ ایک عرصہ سے ''زبان وادب'' کی قیمت دس روپے چلی آ رہی ہے، حالاں کہ اس کی اشاعت پر اس کی قیمت سے دس گونہ زیادہ خرچ آتا ہے، لہٰذا اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے رسالہ کی قیمت میں ہلکا سا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ آئندہ ماہ سے ''زبان وادب'' کی قیمت فی شمارہ پندرہ روپے ہوگی اور زرسالہ ایک سو پچاس روپے ہوگا۔

ان سارے امور پر ہمارے وزیر محترم ڈاکٹر عبدالغفور کے مفید مشورے ہمیں دستیاب ہوتے رہتے ہیں اور ان کے مشوروں کی روشنی میں آگے کا لائحہ عمل تیار کرنے میں معاونت ملتی ہے۔

یہ رسالہ تیاری کے آخری مرحلوں میں تھا کہ معروف فکشن نگار پیغام آفاقی کے انتقال کی خبر نے اردو دنیا کو سوگوار کر دیا۔ انہوں نے تقریباً ساٹھ سال عمر پا کر اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ ان کا تعلق بہار کے چاپ ضلع سیوان سے تھا۔ وہ انڈین پولیس سروس میں اعلیٰ منصب پر رہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو فکشن کی بے پناہ خدمت سے بھی اپنی شناخت بنائی۔ پیغام آفاقی کی ادبی زندگی تقریباً چالیس برسوں پر محیط ہے۔ یوں تو انہوں نے شعر وشاعری کی دنیا میں ''درندہ'' اور افسانے کی دنیا میں ''مافیا'' بھی پیش کیا، لیکن ان کی اصل شہرت ان کے ناول ''مکان'' اور ''پلیتہ'' سے ہے۔ بھرپور عصری حسیت کے ساتھ انہوں نے اپنے فکشن میں، فنی تقاضوں پر پوری نظر رکھتے ہوئے، عام فہم زبان اور خوبصورت اسلوب میں زندگی، سماج اور ماحول سے پیدا شدہ حالات کو آئینہ کیا ہے۔ بیشک وہ منفرد فنکار تھے۔ ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بہت مشکلوں سے پر ہو سکے گا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدائے پاک ان کی مغفرت فرمائے اور اردو دنیا کو ان کے نعم البدل سے نوازے۔ آمین

PDF Compressor Free Version

مشرف عالم ذوقی

D-304, Taj Enclave , Geeta Colony , Delhi 110031

قرۃ العین حیدر کی افسانوی کائنات

قرۃ العین حیدر پر لکھنا آسان نہیں۔ آپ پریم چند سے لے کر اردو فکشن کے چار ستون یعنی منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی پر صفحے کے صفحے سیاہ کر سکتے ہیں، مگر قرۃ العین حیدر کے ادب پر لکھنے اور سوچنے کے عمل میں قلم خاموش ہو جاتا ہے۔ کیوں خاموش ہو جاتا ہے، اس کا بھی جواب ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتی تھیں کہ اردو کے نقاد انہیں سمجھ ہی نہیں پائے۔ وہ ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں اور فکشن کی سمجھ نہیں رکھتے۔ جمیل اختر کی کتاب ''انداز بیاں اور میں'' ایک سوال کے جواب میں کہتی ہیں:

''دیکھئے، میں بقراطی، فلسفیانہ گفتگو پسند نہیں کرتی۔ ایک کریٹیو رائٹر جب لکھنے بیٹھتا ہے تو ایک پورا کریٹیو پروسیس ہوتا ہے۔ آپ لوگ بعد میں بحث کرتے ہیں کہ اس طرح کیوں لکھا۔ کریٹیو رائٹر کے معاملے میں آپ لوگ بہت گڑبڑ کرتے ہیں۔''

افسانے اور ناول کے تعلق سے جب علم نفسیات کا ذکر آیا تو یہاں بھی اپنے غصے پر قابو رکھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا:

''مجھے کیا پتہ، کیا میں کسی سائیکٹرک کے پاس جاؤں، تجزیہ کراؤں، پھر بتاؤں کہ کون سی نفسیات کام کر رہی ہے۔ مجھے تاریخ اور ماضی سے دلچسپی کیوں ہے؟ اس کی نفسیات کیا ہے، لکھنے والے کی نفسیات کیا ہوتی ہے۔''

قرۃ العین حیدر پر اچھا اور برا دونوں طرح کا لکھا گیا، مگر آخر تک انہوں نے نقاد کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ میں اپنی بات یہیں سے شروع کرتا ہوں۔ کریٹیو رائٹر کا اپنا ایک کریٹیو پروسیس ہوتا ہے۔ وہ اپنی مخصوص فکر اور وژن کے ساتھ ایک ایسی کائنات میں ہوتا ہے، جس کا تجزیہ کرنا آسان نہیں۔ قرۃ العین حیدر پر بے پناہ لکھا گیا، آج بھی لکھا جا رہا ہے۔ ان کے ادب کو مختلف ادوار، تقسیم ہند، ہجرت، قیام پاکستان، پاکستان سے واپسی، قیام ممبئی اور دہلی کے ذریعہ دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ گھریلو ماحول سے لے کر فنون لطیفہ تک ان کی دلچسپیوں کا تذکرہ بھی بار بار آیا۔ شاید ہی ان کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہو، جسے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو، اس لیے میں ان پرانی باتوں کو دہرانا مناسب نہیں سمجھتا۔ ان کی زندگی ایک ایسے آئینہ کی مثل تھی، جہاں کچھ بھی پوشیدہ نہ تھا اور جو پوشیدہ تھا، وہ ان کی تحریروں کے ذریعہ سامنے آتا رہا، مگر اس کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ جیسے کسی مصور کے شاہکار کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا اور ہر بار کینوس کی آڑی ترچھی لکیروں اور رنگوں کی آمیزش سے خیال و معنی اور فکری بصیرت کی ایک نئی دنیا سامنے آجاتی ہے، اسی طرح یہ کہنا مشکل نہیں کہ قرۃ العین حیدر کی تحریروں تک رسائی کے لیے ابھی اور انتظار کرنا ہوگا۔

یہ بات غور طلب ہے کہ نقادوں کے رویہ سے آخر تک وہ بیزار کیوں رہیں؟ جب کہ ان کے نام کا قصیدے پڑھنے والے بھی کم نہیں تھے اور دوسری طرف ترقی پسند اور جدیدیت کے حامی بھی، جو ان کی تحریروں کے منکر تھے۔ میں سمجھتا ہوں عام فکشن کی طرح قرۃ العین حیدر کے فکشن کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اپنے ہم عصروں میں مختلف ایک طلسمی شخصیت کی حامل اور اس شخصیت پر زبردست مطالعہ کا اثر کہ ماضی، حال اور مستقبل سب تخلیقی پروسیس کے عمل میں شعور کی رو کا حصہ بن کر ایک دوسرے میں سما جاتے، پھر کہاں کا ماضی، کہاں کا مستقبل اور کیسا حال، خود قرۃ العین حیدر کو بھی کہاں پتہ ہوتا تھا، اس لیے شاہین کی پرواز کی طرح آسمانوں، لامکانوں کی سیر کرتی ہوئی وہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ

PDF Compressor Free Version

ایک مکمل دنیا، ایک وسیع کائنات کو بھی اپنے ساتھ ساتھ لیے چلتی تھیں۔ بے شمار تجربات اور وسیع مطالعہ کی بنیاد پر آپ غور کریں تو صرف ''آگ کا دریا'' کو یہ امتیاز حاصل نہیں کہ یہ ڈھائی ہزار برسوں کا قصہ ہے، ان کی عام کہانیوں میں بھی، قصہ چاہے ایک خاندان کا کیوں نہ ہو، لیکن یہ خاندان پھیلتے پھیلتے صدیوں کی داستان میں تبدیل ہوجاتا ہے اور یہ بات محض قصے کہانیوں تک محدود نہیں، کتابوں کے دیباچے، مقدمہ یا پیش لفظ لکھتے ہوئے بھی وہ ایک ایسی فاسٹ ٹرین میں سفر کرتی ہیں، جہاں قصے، واقعات وقت کے کسی ایک لمحہ سے جست لگا کر لامکانوں میں گم ہوجاتے ہیں۔ ولی سلطنت بھی، مغلیہ سلطنت، عہد وکٹوریہ، خلافت عثمانیہ کی تباہی۔ پندرہویں صدی کا یوروپ، ہسپانیہ، پرتگالی، گوا، مغربی کلچر سے پارسی کلچر تک، موسیقی سے مصوری تک، کہیں روہیلہ پٹھانوں کا ذکر، کبھی یوروپ اور لکھنؤ کی تہذیب اور طرز معاشرت پر صفحہ در صفحہ، ترقی پسندوں اور سرخوں پر بیلاگ تبصرہ، قدیم ہندوستان سے آزاد ہندوستان تک کو سمجھنے کی کوشش، آکسفورڈ سے کیمبرج کے ذکر کے ساتھ مشرقی یوروپ اور سابق سوویت یونین کے تذکرے، امریکن مشنریوں، مشرق کی کلونیل، تہذیب، کیٹس، شیلے، ٹیگور کا تذکرہ، اہل لکھنؤ اور سوزخوانی کا فن، تعزیہ داری، محرم کے جلوس، مختلف شہروں کی رام لیلا، پشاور، چٹاگانگ سے قرول باغ تک، مغربی پینٹنگس سے لے کر پردہ نشیں عورتوں تک، ان کا قلم چھلاوہ تھا، رکتا ہی نہیں تھا، اس لیے ایک قصہ شروع ہوتے ہوئے ہزار داستانوں میں پھیلتا چلا جاتا۔

اردو افسانوں نے قرۃ العین حیدر سے قبل یہ رنگ کہاں دیکھا تھا۔ پریم چند سے لے کر منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن چندر کی کہانیوں کے رنگ مختلف تھے۔ ایک کہانی شروع ہوتی تھی اور ختم ہوجاتی تھی۔ وقار عظیم سے لے کر اب تک فکشن اور افسانے کی جو تعریف گڑھی گئی، قرۃ العین حیدر کی کہانیاں اس تعریف سے مختلف تھیں اور اسی لیے جب ان کی کہانیاں قاری اور نقاد کے سامنے آئیں تو حیرانیوں کے در کھلتے چلے گئے۔ موضوع، اسلوب، رنگ وآہنگ، ماحول، فضا، کہانی بیان کرنے کا انداز سب کچھ مختلف تھا اور یہ رنگ اس سے قبل کی کہانیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رومانی کہانیوں سے نکل کر ابھی ابھی ہمارا افسانہ ترقی پسندی اور نئی نئی جدیدیت کی آغوش میں سمٹنے کی تیاری کررہا تھا اور یہ نیا انداز جہاں سرخے بھی معتوب تھے اور جدیدیت کے استعاراتی وعلامتی نظام سے بھی گریز کیا گیا تھا، اس لیے شروعات میں حملے دونوں طرف سے ہوئے، لیکن آخر اس نئے اسلوب کی مخالفت کب تک ممکن تھی۔ ناول اور کہانیوں کا ہر صفحہ یہ اعلان کرنے کے لیے کافی تھا کہ اردو زبان میں ایک ایسی بلند وبالا شخصیت کی آمد ہوچکی ہے، جس کی تحریر کے سامنے مغرب کے بڑے شاہکار بھی کمزور اور پھیکے لگتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار بھی قرۃ العین حیدر کی افسانوی کائنات کے حوالے سے نقاد حضرات بار بار کرچکے ہیں، پھر جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، اس میں نیا کیا ہے؟ قرۃ العین حیدر کے حیات وفن سے متعلق پرانی باتوں کو بار بار دہرانا کیا تضیع اوقات نہیں؟

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ پرانی پرتیں ادھیڑنے سے کبھی کبھی چھن کر کوئی نئی بات سامنے آجاتی ہے۔ میں اس سوال کو پھر سے دہراتا ہوں کہ آخر قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں ایسی کون سی بات تھی کہ ہزاروں معترضین بھی پیدا ہوئے اور اس سے کہیں زیادہ قصیدے پڑھنے والے۔ کالج کے دنوں میں جب پہلی بار ''آگ کا دریا'' کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو چار صفحہ سے زیادہ پڑھنے کی خواہش نہیں ہوئی۔ کہانیاں لکھنے کی شروعات تک میں دوبار اس ناول کے مطالعہ سے گزر چکا تھا۔ ناول کے آغاز میں ایلیٹ کی نظم نقل کی گئی اور نقاد حضرات ایلیٹ کے تصور وقت کو لے اڑے، پھر کسی نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

مجھے شدت سے احساس ہے کہ اس ناول میں صرف ایک ہی کردار ہے اور اس کردار کا نام ہے قرۃ العین حیدر۔ گوتم نیلام کی شکل ہو یا دو ہزار سے زائد برسوں کی داستان کا ہر مسافر، حیات وممات اور کائنات سے وابستہ ہر فلسفے کے پیچھے یعنی بی کا ہی چہرہ ہے۔ شعور کی رو، زندہ پرستان کی جن وادیوں میں بھی لے گئی ہو، لیکن مرکز تو ہندوستان ہے۔ قدیم سے جدید تہذیبوں کے الگ الگ دریا جس سمندر میں مل رہے تھے، وہ یعنی کا ملک تھا اور سمندر کے دھارے میں ''طلسم ہوشربا''، ''الف لیلیٰ''، ''میجک ماؤنٹین''، ''پنچ تنتر'' کی طرح ہزار کہانیاں شامل ہوتی چلی گئی تھیں۔

PDF Compressor Free Version

یہاں ایک نکتہ اور بھی ہے، سترہ سال کی عمر میں لالہ رخ کے نام سے عینی کی جو پہلی کہانی ''ایک شام'' شائع ہوئی، بعد کے تمام افسانے اور ناول اسی کہانی کا ایکسٹینشن تھے۔ عمر کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کثیر مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے سے وہ اس میں اضافہ کرتی چلی گئیں۔

''ایک شام'' ایک لڑکی کی کہانی ہے، جو آسکر وائلڈ کی کتاب پڑھ رہی ہے، ریڈیو سے اختری فیض آبادی کی تانیں سن رہی ہے۔ لیمپ کے نیلے شیڈ پر چینی نقش ونگار کو غور سے دیکھتی ہے۔ سگریٹ، بوہیمیا، لمبے لمبے فرانسیسی دریچے، حجاب کے افسانے، نیپولین، لارڈ نیلسن کی باتیں، لیڈی ہملٹن کا ذکر، سوشلزم، کمیونزم، فاشزم، ناتسی ازم کا تذکرہ..... کافی ہاؤس میں ہونے والی الوداعی پارٹی، لیفٹننٹ کرنل خالو جان اور پرویز رومانی جو ترقی پسند شاعری کرتے تھے، ان سے آگے بڑھیے تو کافی ہاؤس کے کامریڈز، ڈھیلی ڈھالی پتلونیں، شعر وشاعری کی محفل، ادب برائے حیات اور سرمایہ داروں کی باتیں۔ اینگلو انڈین لڑکی، آرکیسٹرا، پام کے گملوں کے درمیان ادب کی باتیں، پٹی کوٹ اور رعنائی جیسے افسانوں کا ذکر..... اور آخر میں آزادی کو ترستا ہوا غلام ہندوستان ..... زندگی کی محض سترہ بہاریں دیکھنے والی ایک لڑکی مکمل سیاسی وسماجی شعور کے ساتھ غلام ہندوستان، تہذیبوں کے تصادم، سرمایہ داری، ادب میں آنے والی تبدیلیوں کو دیکھ رہی ہے، بلکہ تہذیبوں کا یہی سلسلہ پھیلتے پھیلتے ''آگ کا دریا''، ''گردش رنگ چمن''، ''کار جہاں دراز ہے''، ''سیتاہرن'' اور عینی بی کی مختلف کہانیوں تک چلا جاتا ہے۔

ویران ماضی کے لینڈ اسکیپ سے حال کی پتھریلی سڑکوں تک چلتے ہوئے وہ فلیش بیک، زوم اور کیمرے کی مختلف تکنیک کو سامنے رکھتے ہوئے خاموشی سے ایک کے بعد ایک منظر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے، ایک دانشور کی طرح اپنے وژن اور فلسفوں کو لے کر وہ خود بھی سامنے آجاتی ہیں۔ غلام ہندوستان کے تصور کے باوجود اس سترہ سال کی لڑکی کے اندر کوئی منفی فکر نہیں ہے۔ بوہیمن کلچر، نوآبادیاتی نظام، نئے نئے ترقی پسند سرخوں کی فوج پر خاموشی سے تبصرہ کرتی ہوئی، وہ پارٹی اور رقص وسرور کی محفلیں آراستہ کرتی ہے۔ وہ نظام سے شاکی ہے، لیکن ہر رنگ میں بھرپور زندگی جینے کی آرزو بھی پوشیدہ ہے۔ عینی کو جذبات کی نمائش پسند نہیں، رلانا دھلانا مقصود نہیں۔ وہ ایک ایسی داستان گو ہیں، جن کی ترکش میں ہزاروں تیر اور زنبیل میں ہزاروں لاکھوں نہ ختم ہونے والے افسانے پوشیدہ ہیں۔ وہ انتہائی کمال مہارت سے ایک ایک کر کے انہیں نکالتی چلی جاتی ہیں۔

مجموعی طور پر جائزہ لیں تو یہاں صدیوں کی گونج ہے، لیکن اس گونج میں رنج والم کی داستان کی گنجائش نہیں۔ کارمن میں ''ایک شام'' کی یہی لڑکی ایک بڑی سے لی بریٹی بن کر غلطی سے غریب لڑکوں کے ہاسٹل پہنچ جاتی ہے۔ یہ لڑکی کہیں چمپا بن جاتی ہے، کہیں سیتا رام چندانی۔ یہ لڑکی ''ڈالن والا'' کے مختلف کرداروں اور واقعات میں شامل نظر آتی ہے۔ اسی طرح ''جلاوطن'' کی چھمو بیگم، کنول رانی، کشوری کے خیالوں میں کئی جگہ اس لڑکی کا عکس نظر آتا ہے۔ ''ہاؤسنگ سوسائیٹی'' کی ثریا اور سلمٰی میں اسی لڑکی کی جھلک ہے۔ بلکہ ثریا کی کہانی نئے واقعات اور انجام کے ساتھ ''سیتاہرن'' میں بھی دہرائی گئی ہے۔

عینی کے لفظوں میں، آج کی دنیا ایک عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے، جس میں ذہنوں، دماغوں، دلوں اور روحوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فنکار، دانشور اس چور بازار میں بکتے ہیں۔ کہانی کے آخر میں ثریا جمشید کے ساتھ یوروپ چلی جاتی ہے۔ ''سیتاہرن'' کی سیتا رام چندانی مردوں کو کھیلنے والی فطرت کے ساتھ جب خود کو تنہا محسوس کرتی ہے اور عرفان کو تلاش کرنے پیرس جاتی ہے تو عرفان شادی کر کے کہیں اور جا چکا ہوتا ہے۔ کہانی ایک، واقعات ہزار۔ اسلوب میں وہی رنگ وآہنگ، جو عینی کی پہلی کہانی میں موجود تھا اور برس ہا برس گزرنے کے بعد بھی یہی مخصوص رنگ مختلف کرداروں اور نئے واقعات کے ساتھ عینی کی ہر کہانی میں موجود رہا۔

عینی کے فن پارے پر نظر۔ انصاری کا تبصرہ یاد کیجئے، جسے دیکھو باون گز کا، لیکن اس تبصرہ سے عینی کا ادبی قد کم نہیں ہو جاتا۔ صدیوں کے تہذیبی سفر میں انحطاط پذیر معاشرہ ان کا محبوب موضوع تھا اور اس موضوع میں دنیا بھر کے مسائل، دنیا بھر کی قومیں، قدیم ہندوستان، ہندوستان کے رسم ورواج، تقسیم، غلامی، ہجرت اور دیکھے سنے ہزاروں

(بقیہ ص ۲۴ پر)

PDF Compressor Free Version

انجم عثمانی

19/975, Lodhi Colony, New Delhi 110003

عبدالصمد کی کہانی ''ہونی اَن ہونی'' پر تاثراتی گفتگو

گفتگو کے آغاز میں ہی ایک ضروری بات یہ عرض کرنی ہے کہ میں سچ مچ کی ادبی تخلیق کے ''تجزیہ'' قسم کی چیز کا نہ صرف یہ کہ خود کو اہل نہیں پاتا ہوں بلکہ اس قسم کی نقادانہ دانشوری گزیدہ اصطلاحات کو تخلیق، تخلیق کار اور قاری کے درمیان مداخلت بے جا اور اکثر غیر ادبی ذہن کی جگالی سمجھتا ہوں۔

اپنے اچھے دوست غضنفر کے تجزیاتی حکم نامے کے بعد میں نے بہت ایمانداری سے کوشش کی کہ تخلیق کے حوالے سے ''تجزیے'' کے عمل پر غور کیا جائے۔ یقین مانئے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لغت اٹھا کے دیکھی، تجزیے کے معانی تلاش کیے، کئی سیمیناری ڈاکٹروں کے تجزیے کے نام پر تحریر کردہ طول طویل نسخے پڑھے، مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ شاید ہم جیسے کند ذہنوں کے لیے موجودہ سیمیناری تنقیدی تجزیوں سے محرومی مقدر کردی گئی ہے، اس لیے ہم سے نہ کسی ادبی فن پارے کی چیر پھاڑ ہوتی ہے، نہ ادبی تنقید کے کسی دبستاں سے ہم نے تربیت حاصل کی ہے، نہ سیمیناری سیاست کے کسی گروہ سے ہمیں وابستگی کا شرف حاصل ہے اور نہ ہی ادبی شریعت میں تفہیم بالجبر، کو ہم جائز سمجھتے ہیں۔ البتہ جو چیز کہانی کے حوالے سے میرے اور آپ کے درمیان گفتگو کا جواز بن سکتی ہے وہ قاری کا تاثر ہے جس میں آپ جیسے ذہین قارئین و سامعین کو شریک کر کے تخلیق کے لطف کی خوشبو کو بانٹا جاسکتا ہے۔ آئندہ سطور میں میری آپ سے گفتگو کی بنیاد وہ تاثر ہی ہوگا جو ایک قاری کی حیثیت سے عبدالصمد کی کہانی ''ہونی اَن ہونی'' پڑھ کر مجھ پر قائم ہوا۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ عبدالصمد اردو افسانے کے حوالے سے ان معتبر ناموں میں سے ایک اہم ترین نام ہے جن کی بدولت اس دور کے افسانہ نگاروں اور افسانہ دونوں کو وقار و استحکام حاصل ہوا ہے۔ ناول کی شکل میں ان کی طویل کہانیاں ہوں یا افسانوں کے قالب میں مختصر کہانیاں، ان کو نظر انداز کر کے موجودہ اردو فکشن کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ عبدالصمد کے کہانی کہنے کا طریقہ شروع سے کہانی والا رہا ہے۔ انہوں نے کہانی میں کبھی ''حشو'' سے کام نہیں لیا البتہ، زوائد؟ خیر اس پر گفتگو پھر کبھی۔

''ہونی اَن ہونی'' عبدالصمد کی بہت اچھی کہانیوں میں سے ایک ہے (شاید اسی لیے اس پر گفتگو کا حکم دیا گیا ہے) اور ان کی اکثر کہانیوں کی طرح اس میں بھی سماجی سروکار فرد کے حوالے سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ کہانی کے اختتام تک فرد، فرد نہ رہ کر ایک مخصوص طبقہ کا نمائندہ بن جاتا ہے اور اس طرح قاری بھی اس طبقہ میں شمولیت پا کر اس درد کا حصہ بن جاتا ہے جس سے وہ کردار اور کردار کے حوالے سے تخلیق کار گزر رہا ہوتا ہے۔

کہانی ''ہونی اَن ہونی'' جتنے زوردار جھٹکے سے شروع ہوتی ہے، اس جھٹکے کا دباؤ آخیر آخیر تک درد، احتجاج اور مثبت قدروں کی سچی قوت کا وہ علامیہ بن جاتا ہے جو تخلیق کا جوہر ہے اور جسے کسی تجزیاتی جملے میں ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا، بس ایک درد بھرا خوش گوار تاثر، جیسے گلے کو زور سے دبانے کی تکلیف کے بعد گلا کھلا چھوڑ دینے سے جو آرام ملتا ہے، کچھ ایسا ہی، بس اس کے قریب قریب، ہاں ایسا ہی کچھ یا پھر پتہ نہیں، کہانی پڑھ کے خود محسوس کر لیجیے:

> ''اچانک دروازہ کھلا اور کئی افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے اس نے ابھی ابھی بغیر چینی اور دودھ کی چائے کی تیسری پیالی ختم کی تھی اور کچھ دیر آرام کی خاطر بغیر بستر کی چوکی پر لیٹا تھا۔ وہ سب کے سب جانے بوجھے

PDF Compressor Free Version

اور تیکھے تیوروں والے مقامی لوگ تھے اور ان سے کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ وہ یوں بھی دستک دے کر آنے کے قائل نہ تھے اور ہمیشہ دوسروں سے پہلے اپنی بات کہتے تھے۔ یہ مکان خالی کر دو جلد سے جلد۔ باس کا حکم ہے..... اس کے دونوں کانوں کے پاس سے جیسے دو سنسناتی ہوئی گولیاں گزر گئیں اور آنکھوں کے سامنے..... آنکھوں کے سامنے تو وہی کھڑے تھے۔'' (ہونی اَن ہونی)

اس طرح کے دھماکے اور بلند آہنگی کے ساتھ کہانی شروع ہوتی ہے، مگر یہ بلند آہنگی موضوع کے ساتھ میل کھاتی ہے، بلکہ یہ موضوع کی بلند آہنگی ہی ہے جس کی گونج کرداروں اور پلاٹ میں گونج رہی ہے، لیکن یہ بلند آہنگی کئی سطحوں پر دھیرے دھیرے چیخ سے سسکیوں اور سسکیوں سے ایک خاموش احتجاج کا روپ دھار لیتی ہے، وہ جو خاموش احتجاج، دھمکیوں اور چیخوں سے کہیں زیادہ سفاک ہوتا ہے:

''ابھی ہمارے پاس پورے دو روز باقی ہیں اس کے بعد کیا ہوگا یہ تم بھی جانتے ہو، پھر کیوں نہ ہم ان دو دنوں میں بھرپور انداز میں اپنا وقت گزاریں؟ کیوں نہ ہم .....یعنی پورے مکان میں جلتی بجھتی موم بتیاں لگائیں، خوب چراغاں کریں سارے شہر کی دعوتیں کریں، دو رات دو دن خوب جشن منائیں.....وہ بیوی کی بات پر چڑ گیا۔ نہیں.....ابھی میں احمقوں کی جنت میں نہیں گئی اور نہ میں نے اپنے ہوش وحواس کھوئے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دو دنوں میں ہم بھرپور انداز میں اپنے مکان کو اپنا سمجھیں۔ اس کی اینٹوں، اس کی مٹی، اس کے گارے، سیمنٹ کی خوشبوں کو اپنے اندر اتار لیں، اتنا اتار لیں.....بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ گم سم سا بیوی کو دیکھتا رہا۔ واقعی وہ ابھی تک اپنے ہی مکان میں لگ بھگ کرایہ دار کے طور پر رہتے آئے تھے۔ اس مکان کا کچھ بھی ان کا اپنا نہیں تھا اور جب وہ مکان ان کا، بالکل ان کا اپنا بن کے سامنے آ کھڑا ہوا تو ان کے پاس صرف دو دن بچے تھے۔ صرف اڑتالیس گھنٹے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔'' (ہونی اَن ہونی)

اس کہانی کی خوبی یہ بھی ہے کہ بلند آہنگ موضوع کو بلند آہنگی سے شروع کر کے سادگی، رچاؤ گہرائی و گیرائی اور فنکارانہ پرکاری کے اس اتار چڑھاؤ سے گزارا گیا ہے کہ قاری کے جذبہ اور سوچ کی سانسیں کہانی کی سطور اور بین السطور کے ساتھ زیر و بم اختیار کرتی ہیں:

''دیکھنا تو گھر میں چھوٹے بڑے ہتھیار کتنے ہیں..... اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ 'ہتھیار؟' بیوی نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ویسے وہ ہنسنا چاہتی تھی۔ وہ اندر گئی اور پھر اس نے اس کے سامنے کچھ گھریلو سامان لا کر رکھ دیا .....'یہ مچھردانی کے ڈنڈے ہیں، یہ دادا جی کی لاٹھی۔ یہ باکی کا ٹوٹا ہوا بلہ۔ یہ ڈنڈے باندھا ہوا پرانا جوتا۔ یہ بابا جی کی زنگ خوردہ تلوار۔ پتھروں اور اینٹوں کے کچھ ٹکڑے..... وغیرہ وغیرہ۔ چھریاں بھی تو ہیں۔ آپ شاید باورچی خانے نہیں گئیں؟' اس کی بیوی نے دو تین مختلف سائز کی چھریاں بھی لا کر رکھ دیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چیزوں کو دیکھا اور ناگواری کے انداز میں بولا: 'میں نے ہتھیاروں کے بارے میں..... اچھا وہ.....ابھی لاتی ہوں.....اس کی بیوی نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور دو تین موٹی موٹی کتابیں اس کے ہاتھ میں لا کر تھما دیں۔ 'یہ کیا؟'..... 'تم جن ہتھیاروں کی بات کر رہے ہو وہ تو اب انہی میں ملیں گے۔' بیوی نے لاپرواہی سے جواب دیا اور پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹنے کے لیے آگے بڑھی..... 'چھوڑ دو انھیں ابھی۔' اس نے اسے روک دیا۔'' (ہونی اَن ہونی)

عبدالصمد نے کہانی ''ہونی اَن ہونی'' کو اس طرح بنا ہے کہ متن کی سادگی، بیانیہ کی عمومیت، موضوع کی بلند آہنگی اور زبان کی ساخت میں کوئی رخنہ پڑے بغیر معانی کی پرتیں دھیرے دھیرے قاری پر اس طرح کھلیں کہ

(بقیہ ص ۱۴ پر)

PDF Compressor Free Version

عظیم اقبال
ادبستان، گنج نمبر ایک، بتیا 845538

شکیلہ اختر کے سو برس

شکیلہ اختر، یادش بخیر، انہیں پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا، رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات نظر سے گزری تھیں، لیکن ان کے بارے میں کوئی تاثر قائم نہیں کر سکا تھا۔ اتفاق کہئے کہ آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی ایک ریکارڈنگ کے ضمن میں دفتر میں حاضر تھا۔ پروگرام ایکزیکٹیو ڈائرکٹر جناب عبدالخالق نے سلام و دعا کے بعد مبارک باد دی اور بتایا کہ بہار اردو اکادمی میں میرا جو افسانوی مسودہ اشاعت کے واسطے مالی امداد کے لئے زیر غور تھا، اس پر محاسبہ شکیلہ اختر کو کرنا تھا۔ انہوں نے اس پر اپنی پرزور سفارش کی اور بڑی ہمت افزا ریمارکس دیے۔ وہ دفتر گئی تھیں اور عبدالخالق نیز شمیم فاروقی سے انہوں نے میری تحریروں کی بڑی پذیرائی کی تھی۔ وہ ایک پیغام بھی چھوڑ گئی تھیں کہ میں وہاں جب بھی پہنچوں، ان سے ملے بغیر نہ جاؤں۔

یوں ان سے سری کرشن پوری کی قیام گاہ پر ملاقات کی سبیل نکلی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑیں۔ وہ مجھے سن رسیدہ سمجھ رہی تھیں، مگر میں ان کی توقعات کے خلاف نکلا۔ اس ایک ملاقات میں وہ یوں گھل مل گئیں کہ جیسے برسوں کی شناسائی ہو، باتیں تھیں کہ ختم نہ ہوتی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے میری تحریروں کی جی بھر کے تعریف کی، پھر اپنی ناآسودگیوں کا ذکر کرنے لگیں، اختر اور بینوی کی باتیں کرتیں اور روتی جاتیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت جذباتی عورت ہیں۔ محض تین چار سال پہلے ہی اختر صاحب کی وفات ہوئی تھی اور ان کا غم اتنا تازہ تھا کہ وہ اپنے جذبات چھپا نہیں پا رہی تھیں۔

بات بے بات وہ خود کو غم نصیب کہتی۔ اپنے بیتے دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ ایسی محویت دکھاتیں جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔

شکیلہ آپا جاذب نظر نہ تھیں۔ ان کے نقوش عام سے تھے۔ ان کی باتوں میں شوخی بھی نہ تھی۔ ان کے لہجے میں بڑی سنجیدگی تھی۔ کبھی کبھی بذلہ سنجی دکھاتیں، لیکن یہ بذلہ سنجی ان کی فطرت کا خاصہ نہ تھی۔ کسی بات پر وہ فوراً ردعمل دکھاتیں اور اس میں کسی لاگ لپیٹ کا دخل نہ ہوتا۔ ان کے مزاج میں مشرقیت رچی بسی تھی۔ وہ خدا اور رسول میں پختہ یقین رکھنے والی خاتون تھیں۔ اپنے مستحکم موروثی عقیدے کے باوجود ان میں رواداری تھی۔ وہ توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد بھی نہ تھیں۔ ان کے خیالات و تصورات کی تشکیل میں اگر ذاتی مطالعے اور خاندانی ماحول نے تعاون دیا تو شوہر کی بے پناہ علمیت اور پرشفقت صحبت سے فیضیاب ہونے میں بھی وہ پیش پیش رہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے بعد میں ایک مراسلے میں یوں رقم طراز ہوئیں:

> ''میرے پاس کسی یونیورسیٹی کی کوئی ڈگری نہیں، لیکن اختر صاحب نے دنیا بھر کا علم بھی سکھایا..... میں تو کچھ بھی نہیں تھی، انہوں نے میرے شوق کو سنوارا۔ دنیا بھر کی علمی اور ادبی کتابوں کا میرے آگے ڈھیر لگا دیا۔ میری زندگی میں ایک بہت ہی پیارا سورج اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ روشن تھا.....''

اپنی زندگی سے اس تابناک سورج کے غروب ہونے کا غم جیسے تیسے وہ جھیل تو گئیں، لیکن اپنی باقی ماندہ زندگی وہ ٹوٹی رہیں۔ اسی صدمہ جانکاہ کو بھلانے کے جتن میں انہوں نے خود کو مصروف رکھا۔ وہ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے میں لگ گئیں۔ اپنی خودنوشت میں گویا ہیں:

> ''میں تو ان کی ساری منور کرنوں کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ بھولے سے بھی کبھی مجھے یہ خیال نہ آیا کہ یہ چمکتا ہوا سورج کبھی غروب بھی ہو سکتا ہے؟ مگر اب گھور

PDF Compressor Free Version

اندھیرے میں انجان راہوں میں لڑکھڑاتی جارہی ہوں، جہاں اختر صاحب کے کہیں نقش قدم نہیں ملتے۔ اب تک وہی پیارے نقش قدم ہی تو میرے لئے چراغ راہ تھے۔ منزلوں تک پہنچانے والے روشن ستارے، پر اب؟ اب تو کچھ بھی نہ رہا۔ دل جب بری طرح گھبرانے لگتا ہے تو افسانے لکھنے لگتی ہوں۔''

کچھ دنوں کے لئے اپنے اعزا سے ملنے وہ پاکستان کے سفر پر جارہی تھیں، انہوں نے لکھا کہ ان سے مل لوں۔ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کھل کر باتیں کیں۔ وہ بولنے میں یکتا تھیں، لیکن بیچ بیچ میں سننے پر بھی آمادہ ہوجاتیں! اپنی چند کتابیں دستخط کرکے انہوں نے عنایت کیں اور ان کے متعلق میرے خیالات جاننے کی متمنی بھی ہوئیں۔

کئی دیگر مواقع پر بھی شکیلہ آپا سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی پروگرام اڈوائیزری کمیٹی میں ہم دونوں شامل ہوئے تو ان کی نشستوں میں سامنا ہوا، ان ہی دنوں میرا ڈرامہ ''کوئی وعدہ نہیں'' نشر ہوا تھا۔ ڈرامے کے پیش کار نے نشست میں میری پذیرائی کی۔ اسسٹینٹ ڈائرکٹر سے ڈرامے کا خصوصی ذکر کیا۔ اس موقع پر شکیلہ آپا نے بھی میری پیٹھ تھپتھپائی۔

بہار اردو اکادمی کے فکشن سیمینار میں وہ میرے دوش بدوش رہیں۔ پٹنہ اور اطراف کے نوجوان لکھنے والوں سے انہوں نے تعارف کرایا۔ کئی لوگوں کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ خدا بخش لائبریری نے فکشن سے متعلق اگلے سال ایک تقریب کا انعقاد کیا تو اس میں بھی میرے ساتھ ساتھ رہیں، پھر دو سال بعد خبر ملی کہ وہ بہت علیل ہیں اور پٹنہ میڈیکل کالج کے پے ٹنگ کاٹج میں زیر علاج ہیں۔ ان کی علالت کی خبر شمیم فاروقی نے دی تھی اور میڈیکل کالج کے کاٹج میں ان کی عیادت کے لئے انہوں نے میری ہمراہی بھی کی۔ ان دنوں اسٹیمر سے گنگا پار کرنا پڑتا تھا اور پھر ٹرین ملتی تھی۔ انہوں نے شمیم فاروقی کو تاکید کی کہ وہ مجھے مہندر گھاٹ جا کر چھوڑ دیں۔ شمیم فاروقی کے ساتھ ان کے معاون نیاز بھی تھے۔

غرض کہ شکیلہ آپا سے جو چند ملاقاتیں ہوئیں، وہ بے حد اپنائیت والی تھیں۔ ان سے طویل مراسلت کا سلسلہ بھی رہا۔ شکیلہ آپا کے ادبی رجحان کو اختر اورینوی نے متاثر ضرور کیا، لیکن ادب سے ان کی دلچسپی کے لئے ان کے گھریلو ماحول کی بھی اہمیت ہے۔ اس ماحول کی ایک جھلک دیکھئے۔ اپنے مراسلے میں مجھے لکھتی ہیں:

''کیا تم نے 'ہمایوں' کے پرانے پرچے کبھی نہیں دیکھے ہیں؟ میں بہت چھوٹی سی تھی۔ اس وقت اٹک اٹک کر پڑھنا سیکھ رہی تھی۔ ابا جان اور اماں جان کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس وقت کے سارے رسالے زنانہ، مردانہ، سبھی آیا کرتے تھے، تو جناب ایک دن میں نے بڑا اچھا چکنے چکنے ورقوں والا رسالہ ہاتھ میں لیا اور اسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔''

شکیلہ آپا کے ادبی کیریر کے آغاز اور اس کی توسیع کے سلسلے میں ان کی اپنی یادیں ملاحظہ کیجئے، لکھتی ہیں:

''میں نے ۱۹۳۶ء سے افسانہ لکھنا شروع کیا، جب کہ میری عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ میرا پہلا افسانہ بھی 'ادب لطیف' جیسے چوٹی کے معیاری رسالے میں، چھپا تھا اور صرف چھپنا ہی نہیں تھا، ایڈیٹوریل میں پورا صفحہ میرے افسانے کی تعریف سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے پرخلوص طور پر یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ میں شاعری چھوڑ کر صرف افسانے لکھا کروں۔ تب سے آج تک بفضلہ تعالیٰ میرے افسانے 'ادب لطیف'، 'افکار'، 'نیا دور' (کراچی) اور 'نقوش' میں چھپتے رہے ہیں اور اب تک چھپ رہے ہیں۔''

ان کی اپنی تربیت میں ان کے اپنے مطالعے نے بڑی مدد کی، جس وقت انہوں نے لکھنا شروع کیا، وہ ترقی پسند تحریک کا دور عروج تھا۔ فطرتاً وہ اس تحریک سے متاثر ہوئیں اور اس کے اصولوں پر کاربند بھی ہوئیں۔ ترقی پسندی کو ایک بار اپنا شعار بنا لینے کے بعد تاحیات وہ اس کی پابند رہیں، ادب کی بدلتی ہوئی صورتوں کو سراہ نہ سکیں، یہ واقعہ ہے کہ ترقی پسندی سے انہوں نے اثر لیا، لیکن وہ دوسرے ترقی پسندوں کی طرح

PDF Compressor Free Version

اشتراکی نہ بن سکیں۔اشتراکی اصولوں سے منحرف ہونے کی وجہ ممکنہ طور پر یہ ہوسکتی ہے کہ ان کی زندگی میں مذہب کی جڑیں گہرائی تک پیوست تھیں۔

نوشتوں کی تن آسانی سے وہ بے حد نالاں تھیں اور ساتھ ہی ترسیل کی حمایتی بھی تھیں۔ ان کی نگاہیں گرد و پیش سے باخبر تھیں۔ ماحولیات اور سماجیات سے بھی وہ لاتعلق نہ تھیں۔شہری زندگی پر دیہاتی زندگی کو ترجیح دینے کی ان کی اپنی منطق تھی۔

ہندوستان میں شکیلہ آپا کی تخلیقات جتنی سراہی گئیں،اس سے کہیں زیادہ ان کی پذیرائی پاکستان میں ہوئی۔وہ رقم طراز ہیں:

"ہندوستان کا ادبی مزاج جیسا کہ اس وقت کے ادیبوں نے کئی فارمولوں کے ذریعے بنایا تھا،شاید میں ان کی کسوٹی پر نہیں اترتی تھی۔آخر تھک ہار کر میں نے 'نقوش' کا دامن تھاما اور خدا کا شکر ہے کہ میرے افسانوں کو برسوں بعد ان کا مقام ملتا چلا گیا۔"

شکیلہ اختر اردو کی خاتون افسانہ نگاری کی صف میں پیش پیش ہیں۔انھیں عصمت چغتائی،حجاب امتیاز علی،قرۃ العین حیدر اور ہاجرہ سرور کی ہم سری حاصل ہے۔ان کا پہلا مجموعہ "درپن" ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔دوسرا "آنکھ مچولی" ۱۹۴۰ء میں،تیسرا "ڈائن" ۱۹۵۲ء میں،چوتھا "آگ اور پتھر" ۱۹۶۷ء میں اور پانچواں "تنکے کا سہارا" ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ ان کا چھٹا مجموعہ "لہو کے مول" ہے۔اپنے ساتویں افسانوی مجموعہ "آخری سلام" کی اشاعت کے ساتھ انہوں نے اپنے شائقین سے وداع لی۔

وہ کہانیاں جو شکیلہ اختر کی شناخت بنیں اور جنہیں قبولیت عام حاصل ہوئی،ان کا شمار یوں ہے۔"سرخ مہندی"،"گھر یا ویرانہ"، "بزدل"،"بکھرے ہوئے پھول"،"سیندور کی ڈبیا"،"آنکھ مچولی"، "آخری سلام"،"میرا بیٹا"،"منگلا ہاٹ کی راج کماری"،"گنگرین"، "اسٹیل والا" اور "سویا ہو خدا" ان کی تخلیقات میں جو سچائی اور ایمانداری ہے،وہ ان کے اپنے تجربوں اور مشاہدوں پر مبنی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اپنی تخلیقات میں اپنی ذات کے رنج و ملال کو وہ پوشیدہ نہ رکھ پائیں۔ان کے افسانوں میں احساس کی ناآسودگی بھی ہے اور جذبے کی نارسائی بھی۔ان کے بیشتر افسانوں میں ایک حزنیہ کیفیت ہے،پھر بھی ان سے ہم بددل نہیں ہوتے۔بقول ڈاکٹر عبدالمغنی:

"یہ کہانیاں ہمیں چونکاتی،اکساتی اور جھنجھوڑتی ہیں۔ ہماری بصیرت اور محبت کے سامنے زندگی کا ایک چیلنج پیش کرتی ہیں۔"

آیئے،اب شکیلہ اختر کی مشہور کہانی "آنکھ مچولی" کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کہانی عورت کی ماں بننے کی شدید خواہش کو پیش کرتی ہے۔فیض کی اہلیہ پروین بارہ سالوں کی ازدواجی زندگی میں اولاد کے لئے ترس رہی ہے۔زندگی کی اُداسیاں اسے گھیرے ہوئی ہیں۔وہ پڑوس کے گھوش بابو کے چھوٹے بچے گلاب کو اپنی ممتا سے مالا مال کر دیتی ہے۔ گلاب کی اپنے گھر میں قدر و قیمت نہیں۔معمولی معمولی غلطیوں کے لئے اسے ڈانٹ سننا پڑتی ہے،اسے سہم سمٹ کر رہنا پڑتا ہے۔ پروین کی گود میں اسے بہت سکون ملتا ہے۔پروین بھی اسے اولاد کی طرح چاہتی ہے،پھر یکا یک امید کی ایک کرن جھلملاتی ہے۔پروین امید سے ہے۔ فیض بہت جتن کرتا ہے کہ وہ خوش رہے،اس کے گرد خوبصورت چیزوں کا انبار لگا رہے تا کہ پروین کی تخلیق پر اس کے ماحول کی خوبصورتی اثر انداز ہو۔خوبصورت،ہنستے مسکراتے بچوں کی تصویریں دیکھ کر پروین کے دل میں ممتا کی ہمک اٹھتی ہے،مگر قدرت کو پروین کی یہ خوشی نہیں بھائی۔ پروین کا حمل ضائع ہو جاتا ہے۔ ایک بار وہ پھر اداسی کی بے پناہ تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے۔

ماں بننے کی خواہش عورت کی شدید ترین خواہش ہوتی ہے۔ جب تک عورت کی اس خواہش کی تکمیل نہیں ہو جاتی وہ ادھوری رہتی ہے۔ یہاں اس نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔چونکہ شکیلہ اختر ذاتی طور پر اس تجربے سے گزریں،اس لئے ان کی پیش کش جاذب اور اثر انگیز ہے۔

یہ درست ہے کہ افسانوں کی دنیا میں شکیلہ اختر نے کسی رہبر کا کردار نہیں نبھایا،مگر یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے کسی کی اندھی تقلید بھی نہیں کی،اپنی راہ کا انتخاب انہوں نے خود کیا اور اس راہ پر گامزن بھی رہیں۔ شکیلہ اختر نے جو دیکھا،جو سنا،جو پرکھا،اسے ہی لکھا۔ان کے تجربے اور مشاہدے محدود سہی،لیکن ان کی بنیاد پر انہوں نے جن افسانوں کے تار و پود سنوارے،ان میں سچائی اور ایمانداری کو کبھی بالائے طاق نہیں

PDF Compressor Free Version

رکھا۔ ان کے افسانوں کی فضا ہماری دیکھی بھالی فضا ہے۔ ان میں تصور کی اُڑان کم ہے اور قیاس آرائی کی گنجائش برائے نام۔

شکیلہ اختر کے طویل افسانے یا ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' میں انسانی کمزوریاں دکھائی گئی ہیں۔ یہاں مسز لال کے کردار کے توسط سے کسی عزیز کے ہمراہ زندگی بتانے کی تمنا کا ذکر ملتا ہے، یہاں ایک کم سن لڑکی، مسز لال اور ڈاکٹر کمار کو یکجا کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ قصے کا بیانیہ دلچسپ ہے، حالاں کہ جابہ جا مصنوعیت کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کے کردار اور ماحول دونوں سے تخلیق کار کی دوری ہے۔ ''تنکے کا سہارا'' سے یہ اقتباس پیش ہے جس سے کہانی کی پیش رفت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

''وہ چند دنوں سے ڈاکٹر کمار کے گھر آ گئی تھیں، تسکین اور شانتی کی چند گھڑیوں کا سہارا لئے وہ اپنے سور گباشی شوہر کے گھر سے بھاگ کر یہاں پناہ لینے آئی تھیں، آپ ہی آپ زندگی کے سارے راستے ان پر بند ہوتے چلے گئے تھے اور وہ ایسے کالج کے گھور اندھیارے میں کوئی سہارا ڈھونڈ رہی تھیں۔ پرانی کہانیوں کی طرح بمل نے بھی انگلینڈ جا کر انہیں بھلا دیا تھا۔ ڈاکٹر لال کی دلہن بن کر اب انہیں بھی اس کو بھلانا پڑا تھا۔ فلش اور شراب ان کی دو بہت بڑی کمزوریاں تھیں اور ان ہی دو کمزوریوں کی اوٹ میں مسز لال بمل اور ڈاکٹر دونوں سے اپنا انتقام لے رہی تھیں۔ بمل نے ان کی جوانی اور محبت کو ٹھکرا دیا تھا اور ڈاکٹر لال ایک عمر گزار کر مسز لال کی جوانی اور خوبصورتی میں گہن لگا رہے تھے۔ ڈاکٹر لال زندگی کی بازی ہار گئے، ان کی موت کے بعد اچانک مسز لال کی آنکھیں کھلیں۔ ڈاکٹر لال کے قریبی رشتہ داروں کو ساری باتوں کا علم تھا۔ انہوں نے جی بھر کے بدلہ لیا۔ انہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں مسز لال کو دور دور تک کوئی کنارہ نظر نہ آتا تھا۔ ماں باپ کے بعد بھائیوں کے سر پر وہ بوجھ بن کر رہنا نہ چاہتی تھیں۔ یک بیک ان کو ڈاکٹر کمار کا خیال آیا، جو ڈاکٹر لال کا دوست تھا۔ ڈاکٹر لال کی موت کے بعد اس نے مسز لال کو کچھ دنوں کے لئے اپنے یہاں بلایا بھی تھا کہ وہ اپنا غم ذرا ہلکا کر سکیں۔ مسز لال جس دن یہاں آئی تھیں ڈاکٹر کمار گھبرائے، گھبرائے ان کے پاس آ کر بولے تھے: 'بھابھی اسے اپنا گھر سمجھئے گا' اسی وقت مسز لال کی آنکھوں میں اتنے آنسو بھر گئے تھے کہ وہ ٹھیک سے انہیں دیکھ بھی نہ سکی تھیں۔''

آہستہ آہستہ مسز لال پر حقیقتیں واضح ہونے لگتی ہیں، ڈاکٹر صاحب جب کالج میں تھے، ان کی ایک ہم جماعت مس کوپر تھیں، جو اینگلو انڈین تھیں۔ دونوں میں دوستی ہوگئی۔ دونوں ایک ساتھ کام بھی کرنے لگے۔ کمار کی بیوہ ماں نہیں چاہتی تھیں کہ کوپر، کمار کی بیوی بنیں۔ تقسیم ہند کے بعد کوپر اپنے والدین کے پاس لاہور چلی گئی، پھر کوپر کی شادی کی خبر اس دن آئی جب کمار کی ماں کو مرے دو دن ہو چکے تھے۔

ادھر ڈاکٹر کمار کی راتیں شراب میں ڈوبی رہتیں۔ یہ دیکھ کر مسز لال کڑھتیں۔ ڈاکٹر کمار اور مسز لال کے درمیان جو تصادم ہوتا ہے، اسے کہانی کار کی زبان سنئے:

''ڈاکٹر کی بے توجہی کو دیکھتے ہوئے مسز لال کے اندر چھپی ہوئی عورت بیقرار ہونے لگی تھی، جس کو اپنے پندار اپنے حسن اور اپنی کشش کا پورا پورا احساس تھا۔''

دوسری جانب ڈاکٹر کمار تنہائی کے عادی ہو چکے تھے۔ انہیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ کوئی اور اس گھر میں رہتا ہے۔

اپنے اکیلے پن کو کم کرنے کے لئے مسز لال نے پہلے تو ایک بلی پالی، لیکن اس کے سبب جو گندگی پھیلی، اس سے اسے باہر کا راستہ دکھانا پڑا۔ اب ڈاکٹر کمار کے کارپرداز مرتنجا بابو اسپتال سے ایک صاف ستھری بچی لے آئے، جس نے مسز لال کی ممتا کی پیاس بجھانے میں مدد کی۔ بچی پڑھنے لگی اور دھیرے دھیرے اس نے مسز کمار اور مسز لال کو یکجا کر دیا، جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہوں۔ کہانی کا خاتمہ ملاحظہ فرمانے کے لئے یہ اقتباس دیکھئے:

PDF Compressor Free Version

"جب ڈاکٹر کمار ان کے قریب آ گئے تو وہ اچانک ان کے قدموں پر جھکیں اور ان کے پاؤں کی دھول بڑی پوتر تا کے ساتھ اپنی مانگ میں بھر لی۔"

ظاہر ہے زیر نظر تخلیق میں بشری کمزوریاں اجاگر ہوئی ہیں۔ آدمی کی یہ آرزو کہ وہ کسی اپنے کی قربت پالے، پیش ہوئی ہے۔ انسانی رشتوں کی استواری کے لئے یہ ناگزیر ہے۔

چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا کی پیکر تراشی میں شکیلہ اختر نے "تنکے کا سہارا" کی داغ بیل ڈالی ہے۔ قصے کا بیانیہ سپاٹ ہے۔ اس کی زبان وہی ہے، جسے روزمرہ کی بولی سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ جملوں کی تراش خراش میں تخلیقیت کی کمی نظر آتی ہے۔ کرداروں کو پروان چڑھانے کے اور بھی مواقع نکالے جاسکتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ ناول رواروی میں تحریر کیا گیا ہے، اس میں جانفشانی کم ہوئی ہے، اسے ایک طے شدہ سانچے میں فٹ کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فلمی انداز میں تحریر شدہ "تنکے کا سہارا" ایک معمولی ناول ہے، جس میں عورت کے استحصال کی خبر تو ملتی ہے، لیکن اس کی صورت گری سے گریز کیا گیا ہے۔

ناول کے مقابلے افسانوں میں شکیلہ اختر کے جوہر زیادہ کھلتے ہیں۔ مثال کے لئے ان کے افسانے "ڈائن" کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بدصورت ظاہر کے پس پردہ خوبصورت باطن کی جلوہ نمائی ہوئی ہے۔ ایک کریہہ صورت مچھلی والی اپنی سن رسیدگی کے دور میں ایک گھر سے ایک چھوٹی سی رقم کا بقایہ وصول کرنے جاتی ہے تو وہاں قرض دار کے فوت ہونے کی خبر سے وہ نہ صرف دکھی ہوتی ہے، بلکہ قرض کی وصولی سے بھی انکار کر دیتی ہے۔ فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ افسانے میں زبان و بیان کے اوصاف بھی ملتے ہیں۔

شکیلہ اختر کی تاریخ پیدائش ۱۶، اگست ۱۹۱۶ء مانی گئی ہے۔ ان کی شادی ۲۵ مئی ۱۹۳۳ء کو اختر اورینوی سے ہوئی۔ ان کا انتقال ۱۰ر فروری ۱۹۹۴ء کو ہوا۔ وہ اپنی مصروفیات کے باوجود زندگی کے سفر کی طوالت سے اکتا گئیں تھیں۔ اپنے ایک مراسلے میں انہوں نے مجھے لکھا تھا:

"زندگی کے ریگستانوں کو بڑی مشکلوں سے پار کرتی ہوئی موت کے دریا میں اب پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ پتہ نہیں کس وقت موت کی دھارا اپنی تڑپتی ہوئی موجوں میں بہا کر لے جائے۔"

انہوں نے آخری سانس لی تو ادبی دنیا، خصوصیت سے بہار کی ادبی دنیا بے حد سوگوار ہوگئی۔ مختصر یہ کہ گھریلو تعلیم اور گھریلو ماحول میں شکیلہ اختر کی جو تربیت ہوئی اس سے انہوں نے ادب میں اپنا مقام حاصل کیا اور بعد کی نسلوں کے لئے قابل قبول ہوئیں۔ ❁❁

عبدالصمد کی کہانی "ہونی اَن ہونی" (ص ۹ سے آگے)

واقعہ ختم ہونے کے بعد بھی کہانی نہ صرف جاری رہے بلکہ ذہنوں میں اس طرح پیوست ہو جائے کہ سماج کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرنے لگے اور قاری خود کو اس کیفیت میں شریک پائے جس کیفیت سے کہانی کے کردار اور کردار کے حوالے سے تخلیق کار دوچار ہے۔

"ہونی اَن ہونی" کئی لحاظ سے مختلف امکانات رکھتی ہے۔ یہ کسی ایک خاندان کی کہانی بھی ہے اور کسی ایک طبقے، کسی ایک قوم کی کہانی بھی ہے۔ یہ کردار کی کہانی کی کہانی بھی ہے، واقعہ اور تاثر کی کہانی بھی ہے اور جبر، جبلت، ظلم، ظالم، مظلوم، احتجاج اور درد کی کہانی بھی ہے۔

اس کہانی کو معانی کی کئی سطحوں پر محسوس کیا جاسکتا ہے اور اس کہانی کی کوئی پرت کہانی سے الگ نہیں ہے۔ قصہ صورت حال میں، صورت حال کردار میں، کردار سماج میں، سماج ذات میں، ذات تخلیق میں اور تخلیق، تخلیق کار میں اس طرح پیوست ہیں کہ اس کا "تدریجی تیاپانچہ" کر کے "تجزیہ" وغیرہ کرنا اپنے آپ کو کہانی کے لطف و تاثر سے محروم کرنا ہے اور کہانی کے قاری کی حیثیت سے کم از کم میں اس حق سے محروم نہیں رہنا چاہتا، پھر بھی آپ اس مختصر سی تاثراتی گفتگو کو "تجزیہ وغیرہ" کہنے پر مصر ہیں تو آپ کی مرضی۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر سید احمد قادری

7, New Karimganj, Gaya (Bihar)

سیاست میں ادب کے سفیر: ڈاکٹر سید احمد

جولوگ ملک کے طول وعرض کی سیاست اور خاص طور پر ہندوستان کی صنعتی اور مشینی زندگی سے بھرپور ریاست مہاراشٹر کی سیاست اور سیاستدانوں پر نظر رکھتے ہیں، انہیں ڈاکٹر سید احمد کی سیاسی فعالیت کا بخوبی کا اندازہ ہوگا۔ شنکر راؤ چوہان، شرد پوار، ولاس راؤ دیش مکھ اور سشیل کمار شنڈے کی وزارت میں وزیر کی حیثیت سے انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، انہیں فراموش نہیں کیا جاسکا ہے۔ اتنے متحرک اور فعال سیاست داں کا اردو زبان وادب سے اس قدر والہانہ لگاؤ، یقینی طور پر صحرا میں خوشگوار جھونکے سے کم نہیں۔ بہت کم ایسی شخصیات ہمارے سامنے آئی ہیں، جو سیاست اور ادب میں یکساں طور پر متحرک اور فعال رہی ہوں۔ شکیل الرحمٰن، غلام سرور اور عثمان عارف وغیرہ کے نام فوری طور پر ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں، لیکن یہ لوگ بھی ادب اور سیاست کو لے کر ایک ساتھ نہیں چلے، ادب میں فعال رہے تو سیاست چھوٹی اور سیاست میں متحرک ہوئے تو ادب کے میدان سے غائب رہے۔ ہاں ماضی میں ایک شخصیت ایسی ضرور گزری ہے، جو ادب اور سیاست کے میدان میں مسلسل نمایاں رہی، وہ شخصیت تھی، مولانا ابوالکلام آزاد کی، جنہوں نے اپنی پوری زندگی ادب، صحافت اور سیاست کے لئے وقف کردی تھی۔

عصر حاضر میں ایک ایسی ہی شخصیت ہمارے سامنے ڈاکٹر سید احمد کی ہے، جو مختلف ادوار میں ریاست مہاراشٹر کی بساط سیاست پر اپنی بے پناہ قومی اور ملی خدمات سے چھائے رہے، ساتھ ہی ساتھ معروف سیاسی زندگی میں اور ادب کے میدان میں بھی اپنی موجودگی کا احساس کراتے رہے۔ ''قفس سے چمن تک''، ''مقتل سے منزل تک''، ''اردو شاعری کا انقلابی کردار'' اور ''پگڈنڈی سے شاہراہ تک'' ایسی تالیف وتصنیفات ہیں، جن کے مطالعہ سے ان کتابوں کے مرتب اور مصنف کا قومی وملی شعور آشکار ہوتا ہے، اس کا دردمند دل انگریزوں کے مظالم اور مجاہدین آزادی کی عملی اور ادبی کوششوں سے متاثر ہوتا ہے اور انہیں وہ آنے والی نسلوں کے لئے یکجا کردیتا ہے کہ دیکھو ہمارے اسلاف اور مجاہدین آزادی نے اپنے ملک کی سالمیت اور بقا کے لئے، اس کی تہذیبی، معاشرتی، سماجی، سیاسی اور ادبی محاذ پر کس طرح کی مثالیں پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر سید احمد کی کوئی بھی کتاب اٹھایئے، اس کی ورق گردانی کے دوران یہ بات بڑی واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر سید احمد کا مختلف زبان وادب کا مطالعہ بڑا گہرا ہے۔ ''اردو شاعری کا انقلابی کردار'' حالانکہ ڈاکٹر سید احمد کا ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ہے، لیکن اس میں علم وادب کی جو گہرائی اور گیرائی ہے، وہ ڈاکٹر سید احمد کے نہ صرف عمیق مطالعہ کا اشاریہ ہے بلکہ اس میں فہم وفراست، اعلیٰ معیار اور تحقیقی وتنقیدی مزاج کے نمونے بھی ہیں۔ یوں تو اردو شاعری کے سیاسی، سماجی اور انقلابی پس منظر میں کئی اہم کتابیں شائع ہوچکی ہیں، خاص طور پر تحریک آزادی میں اردو شاعری نے جو انقلابی کردار نبھایا ہے، اس موضوع پر بھی کئی تصنیفات منظر عام پر آئی ہیں، لیکن سید احمد کی اس کتاب (تحقیق) کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے ایسی تمام کتابوں سے الگ ہٹ کر اردو شاعری کے حوالے سے مختلف ادوار میں اس کے انقلابی کردار اور پوری تحریک آزادی کا بڑے موثر انداز میں منظر نامہ پیش کیا ہے اور اس منظر نامے کی یقینی صورت حال واضح کرنے کے لئے جگہ جگہ نظموں، مثنویوں اور مرثیوں کے انقلابی تیور کو دکھاتے ہوئے جو اشعار پیش کئے ہیں اور ان اشعار میں جو برجستگی، شعلگی اور وارفتگی ہے، ان پر

PDF Compressor Free Version

جس طرح اپنی آرا کے ساتھ ساتھ معتبر و مستند نقادوں کی آرا کے اقتباسات نقل کیے ہیں، وہ لائق مطالعہ ہیں۔ مثلاً مذکورہ کتاب کے آخری صفحہ پر آل احمد سرورؔ کی اس رائے کے ساتھ اپنی بات مکمل کی ہے کہ:

''شاعر لیڈر نہیں ہوتا، وہ ہر واقعہ کو انقلاب اور ہر موج کو طوفان نہیں بنا سکتا، وہ طوفان و انقلاب کے لئے فضا تیار کرتا ہے۔''

ڈاکٹر سید احمد نے یہ اقتباس نقل کر کے پوری اردو شاعری کے انقلابی کردار کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ ایسے اقتباس اور ڈاکٹر سید احمد کے قوی شعور اور تاریخی وجدان کے برملا اظہار و بیان سے یہ کتاب ایک دستاویز بن گئی ہے۔

اس دستاویز میں میر تقی میرؔ سے لے کر فیض احمد فیضؔ اور جاں نثار اخترؔ تک کے انقلابی شعری افکار و اظہار اور متنوع کیفیات کے اشعار کو رقم کر کے قابل قدر بنایا گیا ہے۔ بہار کے جمیلؔ مظہری کی دو نظمیں ''بھارت ماتا'' اور ''موسم کے اشارے'' کو بھی جگہ دی گئی ہے، کلیم الدین احمد اور اختر اورینوی کے نقد پارے بھی شامل ہیں، لیکن انقلابی شاعری کی روح ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

جیسا شعر کہنے والے (سید شاہ محمد حسن) بسملؔ عظیم آبادی اور ''ایک نوجوان سپاہی کی موت، میدان جنگ میں'' جیسی معرکتہ الآرا نظم کے خالق سید محمد اسمٰعیل صاحب رساؔ ہمدانی گیاوی وغیرہ جیسے شعرا کے ذکر کے بغیر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

ویسے ڈاکٹر سید احمد نے ایک بے حد اہم موضوع پر مبنی اپنی اس کتاب میں جس طرح عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے اور تحقیق کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی افکار و نظریات کے منطقی استدلال کو پیش کیا ہے، اس نے اس پوری کتاب کو بے حد معیاری اور وقیع بنا دیا ہے۔ یوں تو اس کتاب میں ایسے بہت سارے افکار و اظہار ہیں، جو خوبصورت اسلوب میں بدلتے وقت اور حالات کی سنگینی سے متعارف کراتے ہیں، مگر فی الحال میں ڈاکٹر سید احمد کے ایک اقتباس پر اکتفا کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر سید احمد لکھتے ہیں:

''سماجی انقلاب سے پہلے تناؤ۔ غلط طریقے سے نبھاؤ اور رجع القہقری کی ایک فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس فضا میں عوام سے خلوص و وفا، غیرت و حمیت کے جذبات مفقود ہو جاتے ہیں اور شاہوں میں بصیرت و آگہی ختم ہو جاتی ہے۔ سلطنت شاہ عالم دلی سے پالم تک محدود ہو جاتی ہے، لیکن شاہ کے سر سے بادشاہت کا سودا نہیں جاتا۔ حقیقت کے چشموں سے تشنگی کا مداوا کرنے کے بجائے وہ فریب کے سرابوں سے بہلتا رہتا ہے۔ غالباً اس صراحت کے بعد مصحفیؔ کے اشعار کو ان کے تاریخی پس منظر پر منطبق کیے بغیر بھی انقلاب کی آنچ میں تمتماتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔''

(اردو شاعری کا انقلابی کردار، ص ۱۲۰)

اس کتاب میں ''تبصرہ'' کے عنوان سے معین اعجاز نے ایک جگہ بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ:

''وہ (ڈاکٹر سید احمد) ادب میں سیاست اور سیاست میں ادب کے سفیر ہیں۔ امید ہے کہ وہ اپنی سیاسی معروفیت سے وقت نکال کر آئندہ بھی اردو والوں کو فیض پہنچاتے رہیں گے۔'' (ص ۲۹)

اس مختصر اقتباس کے بعد ''عرض مصنف'' کے تحت ڈاکٹر سید احمد کی تصنیف کے تعارف کے دوران ایک جگہ بطور خاص نظر ٹھہر جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید احمد لکھتے ہیں:

''اردو زبان و ادب کے ساتھ اپنوں اور بیگانوں نے ناانصافیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ روا رکھتا ہے، جو اردو اکاڈمیوں کے قیام کے بعد بھی ختم نہیں ہو سکا اور اردو کو بدستور مسلمانوں کی زبان قرار دے کر فرقہ پرستی کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے اور اردو کے لئے مراعات کے اعلان کو سرکار کی اقلیت نوازی کہہ کر خوب شور مچایا گیا۔'' (ص ۲۹)

معین اعجاز اور ڈاکٹر سید احمد کے درج بالا اقتباسات (بیان) کی معنویت موجودہ وقت میں یقیناً زیادہ بامعنی ہو گئی ہے۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر جاویدہ حبیب

Academy of Islamic Research 310, Bharathidasan Road, S.I.E.t. Teynampet
Chennai 600018 (Mob.09884337214)

تمل ناڈو میں اردو

تمل ناڈو کی ادبی تاریخ سے متعلق بہت سارے مضامین مولوی نصیرالدین ہاشمی، حکیم شمس اللہ قادری، ڈاکٹر جمیل جالبی، محوی صدیقی، پروفیسر محبوب پاشا، مولانا یوسف کوکن، ڈاکٹر افضل الدین اقبال، مختار بدری، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر سید صفی اللہ، ڈاکٹر سجاد ظہیر، ڈاکٹر راہی فدائی، ڈاکٹر احمد ندیم اور ڈاکٹر آصفہ شاکر کی کتابوں میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ علیم صبا نویدی نے ''تاریخ ادب اردو تمل ناڈو'' اردو اور انگریزی زبان میں چھاپ دی ہے۔ علیم صبا نویدی کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ موصوف نے تمل ناڈو کے شعرا، ادبا، علما اور خواتین کی اردو خدمات کا تذکرہ الگ الگ کتابوں میں کیا ہے۔

مولوی نصیرالدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں دکن کے تدریجی ارتقا اور شعرا دکن کے حالات کا جو جائزہ لیا تھا، اس میں کئی باتیں تشنہ تکمیل رہ گئی تھیں، ''مدراس میں اردو'' کے نام سے بھی آپ کی تصنیف موجود ہے، جس میں یہاں کی ادبی زندگی، زبان کے ارتقا اور ارباب فن کی خدمات پر کوئی مبسوط تبصرہ نہیں ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ صرف مدراس کی ادبی تاریخ کا اگر عائر مطالعہ کیا جائے اور اس موضوع پر مواد فراہم کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مولانا بحرالعلوم جیسی یگانہ روزگار شخصیت کا ورود مدراس، اہل مدراس کے شستہ ذوق اور یہاں کے علمی وادبی ماحول کی بلند پائیگی کی دلیل ہے، والاجاہی دور میں فارسی مشاعرے اور مشاعروں میں زبان وفن پر تنقیدات کا سلسلہ اور اساتذہ سخن کی استناد یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ یہ سرزمین بھی شمال سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

تیس چالیس سال پہلے تک بعض حضرات کے پاس اس دور کے ادب وفن کا ایک ذخیرہ موجود تھا، جسے اگر گنج ہائے گرانمایہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد کے پاس یہاں کے ارباب سخن کے دواوین، ادبی رسالے اور کئی ایسی مفید ومعلومات افزا چیزیں تھیں، جو محققین کے لئے معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا کے گھر کا کچھ حصہ نذر آتش ہو گیا تھا، لیکن مولانا کو گھر کی آتش زدگی کا نہیں بلکہ اس بات کا رنج تھا کہ بعض نایاب چیزیں نذر آتش ہو گئیں۔ میرے تعلیماتی دور میں مدراس یونیورسیٹی کے کلاسس کے دوران پروفیسر محبوب پاشا نے بتایا کہ مولانا کا برسوں کا دینی، علمی، ادبی ذخیرہ رفتہ رفتہ تیلیوں کی طرح ہوا میں بکھر گیا تھا، جو اوراق بچ گئے تھے، وہ بھی آتش زدہ تھے، جدول کا نشان نہیں ملتا تھا، سیاہ حاشیے زبان حال سے اپنی تیرہ بختی کی داستان سناتے تھے۔ یہ لٹا ہوا سرمایہ انقلابات روزگار کی چیرہ دستیوں کے باوجود بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

تمل ناڈو جس کے متعلق قدیم دور میں شمال کے اکثر احباب کو بہت کم آگہی حاصل تھی اور بعض تو غلط فہمی کے بھی شکار تھے کہ تمل ناڈو میں اردو زبان کا وجود عنقا کے برابر ہے، حالاں کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں شمال کے مقتدر رسائل، ''کمال'' دہلی، ''جلوۂ یار'' میرٹھ، ''پیام یار''، ''پیام عاشق'' قنوج میں وہاں کے اساتذہ کے دوش بدوش یہاں کے شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ آسی ترپاتوری کا بیان ہے کہ:

> ''بادشاہ وانمباڑی 'پیام یار' کے لکھنے والوں میں تھے۔ آپ فارسی میں بھی کہہ لیا کرتے تھے، دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کافی قدرت رکھتے تھے۔ 'پیام یار' لکھنؤ اس صدی کا واحد رسالہ تھا، جس کے لئے اس زمانے کے اساتذہ بھی لکھتے تھے۔ داغ، امیر، جلال، ظہیر اور تسنیم کا کلام میں نے اس میں دیکھا ہے۔''

PDF Compressor Free Version

اسی دور میں حضرت شاکر وانمبا ڈی، حضرت آسی، حضرت اثیم کا کلام بھی بالالتزام مذکورہ رسائل کی زینت ہو بنتا رہا جس کے کم وبیش رسالے حضرت فدوی باقوی کے پاس محفوظ تھے۔ حضرت فدوی نے اپنی تحریروں میں یہ بیان دیا ہے کہ:

''شاطر، راسی، شرر آلندوری، انیق وشارمی، شاداں، طہور اللہ نادر اور شاکر ناشطی کو میں نے 'جلوہ یار' کے صفحوں پر دیکھا ہے۔ جولائی ۱۸۹۸ء شمارہ کے صفحہ ۳ یعنی سرورق کے بعد کے پہلے صفحہ پر ٹی۔ محمد عبدالرحمن انیق و شارمی کا کلام چھپا ہوا تھا۔''

اٹھارہویں صدی میں ''پیام عاشق'' کے نام سے ایک رسالہ قنوج سے نکلتا تھا اس کے ستمبر ۱۸۹۸ء کے شمارہ صفحہ ۷ پر انیق وشارمی کی غزل چھپی تھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

آمد یہ کس پری کی ہوئی صیدگاہ میں
آنکھیں جو عاشقوں نے بچھائی ہیں راہ میں
میری طرح انہیں بھی کسی کی ہے جستجو
بے وجہ گردشیں نہیں یہ مہر و ماہ میں
فرقت میں بھی ہے وصل کی دولت مجھے نصیب
تصویر ان کی پھرتی ہے میری نگاہ میں

اسی طرح شرر اور شاداں کے کلام نے بھی بالالتزام نہ سہی، مگر ان رسائل میں جگہ حاصل کی ہے۔ اس دور میں بقول فدوی باقوی شمال کے اہل فن اور مدیران رسائل یہاں کے شعرا کا کلام خلوص کے ساتھ طلب کرتے تھے۔ خطوط میں کلام کا شدید تقاضا ہوتا تھا اور ان کے کلام جانبداری اور یک طرفگی کے بغیر اساتذہ فن جیسے احسن مارہروی، حضرت نوح وغیرہ کے دوش بدوش شائع کرتے تھے۔ چھوٹی تقطیع پر چھپنے والے ان رسائل میں مصرع طرح دیا جاتا تھا اور اہم شعرا طبع آزمائی کرتے تھے، اگر کوئی تنقیدی نقطہ نظر سے ان تمام کلام کا تجزیہ کرے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کے بعض شعرا کی غزلیں شمال کے اساتذہ کے کلام پر بھاری ہیں، جس کا اعتراف شمس الرحمن فاروقی نے مولانا راضی صدیقی کی غزلوں کا مجموعہ ''زخم تر'' دیکھ کر کیا تھا۔

تقریباً ایک صدی پہلے ہی اردو زبان کے لئے یہاں فضا ہموار ہوگئی تھی، لکھنے والے پیدا ہو گئے تھے، فارسی کی تعلیم عام تھی، اس سرزمین نے ایسے عظیم المرتبت علما اور مایہ ناز ارباب فن پیدا کر دئے تھے کہ جن کی شہرت کے نغمے شمال کی فضاؤں میں گونج رہے تھے۔

۱۹۰۳ء کی بات ہے کہ حضرت شریف مدراسی نے غالب کی زمینوں میں ہم قافیہ وہم ردیف غزلیں کہیں اور پورا کلام دیوان کی صورت میں چھپ کر منظر عام پر آگیا۔ غالب کی شاعرانہ و مفکرانہ حیثیت مسلم ہے، دیوان غالب بقول بجنوری وید مقدس کے بعد الہامی کتاب ہوسکتا ہے، زمانے کی تبدیلیوں اور شعور کے ارتقا کے ساتھ کلام غالب کی نئی نئی تاویلیں اور نئی نئی شرحیں نظر آتی ہیں، مختلف زاویوں سے غالب کو سمجھنے اور ان کے تخئیل کی قوت پرواز پر قابو حاصل کرنے کی کوشش ہوتی رہتی ہے۔ غالب کا کلام اپنی آفاقیت، ہمہ گیری اور بلندی کے لحاظ سے آج بھی دعوت فکر دیتا ہے، غالب کے بعد غالب کے تتبع کو بھی موجب فخر سمجھا گیا۔

مرزا عزیز لکھنوی، اور وحشت کلکتوی نے غالب کی تقلید میں صلاحیت شعری کو بروئے کار لا کر اپنے بہترین جواہر پاروں سے اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا، وحشت کے متعلق مولانا حالی نے یہاں تک کہا کہ ان کی تقلید کامیاب ہے، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ غالب صرف غالب ہے، جس کے خرمن ادب کی خوشہ چینی تو ہوسکتی ہے، لیکن اس کی بلندی تک زقند لگانے کی ہر کوشش میں اب تک ناکامی رہی ہے۔

عزیز اور وحشت کی شہرت کے آگے شریف مدراسی کا نام ''چراغ تہ داماں'' سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اکثر اکابرین ادب مدراس سے متعلق چند تنگ نظر ''بھول بھلیوں'' میں بھٹکتے رہے۔ انہوں نے کبھی اس طرف اپنی توجہ مبذول کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی، ورنہ وہ جانتے کہ یہ سرزمین بھی اردو کے متعلق کس تمکنت اور کس عظمت کی حامل ہے۔ شریف مدراسی کو پڑھنے کے بعد ان کی صلاحیت شعری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

عشق رخسار و سر زلف گرہ گیر بھی تھا
باغ کی سیر بھی تھی، نالہ زنجیر بھی تھا

PDF Compressor Free Version

ہم رشتہ نقاب ہوئی ان کی تاب حسن
دیکھا نظر نے جب کوئی حائل نہیں رہا

کوئی ہے بحر جہاں میں کب کسی کا آشنا
غرق نیرنگی ہیں دونوں آشنا نا آشنا
توبہ توبہ ننگ بے ربطی و کثرت گاہ ربط
عشق ہے ہمدم مرا اور حسن تیرا آشنا

کٹ گیا سر بھی تو میں محبوب جاناں ہی رہا
تیغ کی منت رہی قاتل کا احساں ہی رہا
آہ گرم و چشم تر سے ہجر جاناں میں شریفؔ
برق چمکی ، ابر برسا ، روز طوفاں ہی رہا

دیکھا جو ماجرا مری چشم پر آب کا
تر انفعال سے ہوا دامن سحاب کا
غصہ سے رنگ سرخ ہے روئے جناب کا
پہنا ہے آج مہ نے لباس آفتاب کا

دیکھ لے گر روش خانہ بر اندازیٔ چشم
سیل دریا مری آنکھوں سے روانی مانگے
کوہ کن اور میری ہمت عالی کی طلب
قیس اور مجھ سے یہ آشفتہ بیانی مانگے؟
یہ مجال ابر کی مجھ سے مرا رونا چاہے
برق کی تاب مری شعلہ نشانی مانگے

کہاں ہم اور کہاں اس مہر تاباں کی ہم آغوشی
مگر چوتھے فلک پر طالع بیدار بستر ہے

اظہار غم و داغ جگر ننگ ادا ہے
لالہ ہی میں غیرت ہے ، نہ شبنم کو حیا ہے

یارب مقام جلوۂ صد برق طور ہے
دل کا وہ ایک نقطہ سویدا کہیں جسے

جوش جنوں میں اور کوئی دشت چاہیے
اپنا ہی تو مکاں ہے یہ صحرا کہیں جسے

اب کے جنوں کی دشت درازی تو دیکھئے
سو سو طرح سے دامن دل چاک چاک ہے

یہی تو بات ہے کہنے کی اور کیا کہئے
اگر کریں بھی وہ بے جا بجا کہئے

شریف مدراسی نے تقریباً غالبؔ کی تمام غزلوں پر غزل کہی ہے، بعض غزلوں پر کلام غالبؔ کا دھوکا ہوتا ہے، وہی بلند تخیل، مضمون آفرینی، معنی خیزی، زور بیان اور الفاظ کی چست بندش، کہیں شکست نا روایا ابتذال کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ کلام میں جو بے ساختگی کا انداز پایا جاتا ہے، اس سے ان کی قادر الکلامی، زباں دانی اور علمی قابلیت کے نقوش بھی اجاگر ہوتے ہیں۔ غالبؔ کا تتبع کرنے والوں میں شریفؔ مدراسی کا نام سرفہرست نظر آتا ہے، یہ اور بات ہے کہ وحشتؔ و عزیزؔ کی طرح شریف کو ہندوستان گیر شہرت نصیب نہ ہو سکی اور کوئی حالیؔ یہاں ایسا پیدا نہیں ہوا کہ ان کی ژرف نگاہی اور معنی خیزی کی داد دیتا۔ یہاں کے ارباب فن کے تساہل اور بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ جن میں تنقیدی صلاحیت ہے اور سلجھے ہوئے فکر و شعور کے مالک ہیں، اپنی صلاحیت کو پابہ زنجیر دیکھنا ہی پسند کرتے ہیں وہ ورنہ کیا تعجب کہ تلاش و جستجو کے بعد معلوم ہوگا کہ کتنے داغؔ، کتنے اصغرؔ، کتنے فانیؔ اور کتنے امیرؔ اس زمین کے نیچے بھی روپوش ہیں۔

شریفؔ مدراسی کا یہ سلجھا ہوا انداز، بھرپور تغزل مدل آویز اسلوب اور منجھی ہوئی زبان ناقدین کے لئے دعوت فکر ہے۔ وہ ان پر بہت کچھ لکھ سکتے ہیں، شریفؔ کا بھی ایک مقام متعین ہو سکتا ہے، یہ شعر۔

یارب مقام جلوۂ صد برق طور ہے
دل کا وہ ایک نقطہ سویدا کہیں جسے

سویدا کی عظمت اور مرکز تجلیات کا آئینہ ہے۔ اس شعر کا ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جو بن بلائے مہمان کی طرح داخل ہو گیا ہو۔ رعایت لفظی، حسن بندش اور سلاست کے اعتبار سے بھی یہ شعر اتنا بلیغ اور جامع ہے کہ اس کی شرح میں دفتر کا دفتر سیاہ ہو سکتا ہے۔

PDF Compressor Free Version

یہی تو بات ہے کہنے کی اور کیا کہئے
اگر کریں بھی وہ بے جا بجا کہئے

زبان اور لہجے کی دلکشی کا تصور اعجاز سے کم نہیں ہے اور پھر ''بجا بجا کہئے'' کی تکرار نے اس شعر کی عظمت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ایسا ہی شعر ''غزل'' کی روایت کو زندہ رکھتا ہے، دوشیزۂ غزل کے دہکتے ہوئے عارض کو مدراس کے شعرا نے بھی خون جگر سے آب و رنگ بخشا ہے، ورنہ یہ بات کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی۔

کوہ کن اور مری ہمت عالی کی طلب
قیس اور مجھ سے یہ آشفتہ بیانی مانگے
یہ مجال ابر کی مجھ سے مرا رونا چاہے
برق کی تاب ، مری شعلہ فشانی مانگے

ان کے تیور بتاتے ہیں کہ ہم دل سے نکلے ہیں اور دل میں جگہ حاصل کریں گے۔ ان اشعار میں جذبات کی کتنی صحیح عکاسی ہے اور انسانی عظمت کا کتنا دلآویز نقش آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ لہجہ میں گمبھیر بادلوں کی گڑگڑاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں شاعری کی جوان انگڑائیاں مرکز حسن کی طرف مائل پرواز نظر آتی ہیں۔

نواب عبد الرؤف خان پرتو، جو خاندان والا جاہی سے وابستہ تھے ایک خوش فکر اور بلند پایہ شاعر بھی تھے، جن کے تقریباً چار دیوان چھپ کر منظر عام پر آ گئے ہیں، سردست ان کا کوئی دیوان پیش نظر نہیں ہے، لیکن ان کا شمار بھی صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ شریف مدراسی کے بعد نواب رؤف خان پرتو اور آسی ترپاتوری نے بھی غالب کی غزلوں پر بھرپور غزلیں لکھی تھیں۔ غالباً ۱۹۵۸ء میں پروفیسر رحیم احمد فاروقی آزاد نے غالب کی تمام غزلوں پر تضمینیں لکھیں جو کتابی صورت میں بنام ''تضمینات غالب'' منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں عزیز تمنائی کا اردو سانیٹ کا اولین مجموعہ ''برگ نوخیز'' اور ۱۹۷۸ء میں علیم صبا نویدی کے اولین نعتیہ سانیٹ کا مجموعہ ''نور السنوت'' منظر عام پر آیا۔ ۱۹۷۴ء میں فرحت کیفی کے ترائیلوں کا اولین مجموعہ اردو ادب میں پیش ہوا۔ تمل ناڈو کی سرزمین کا یہ کارنامہ بھی اہم ترین ہے کہ اسی سرزمین سے علیم صبا نویدی کی آزاد غزلوں کا پہلا مجموعہ ''رد کفر'' افق ادب پر چمکا تھا۔

عمدۃ الامرا، نواب غلام غوث خان اعظم بہادر والی ریاست کرناٹک کے فارسی اور اردو کلام کا مختصر مجموعہ ''بہارستان اعظم'' کے نام سے ۱۳۰۰ھ میں چھپ گیا تھا۔ اعظم کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور کافی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ کی صدارت میں فارسی کے زبردست مشاعرے ہوئے جن کا تفصیلی ذکر ''گلزار اعظم'' میں ملتا ہے۔ ''گلزار اعظم'' بھی والا جاہی دور کے ادبی ہنگاموں اور اہل فن کی نکتہ آرائیوں کا آئینہ ہے، برسر مشاعرہ تنقید کا ایک سنجیدہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اعتراضات، غیر ضروری اور کسی چشمک کی بنا پر نہیں ہوتے تھے، دربار سے وابستہ شعرا جو زبان و فن کے بے پایاں سمندر تھے، اس کے ہر پیچ و خم سے واقف تھے۔ ہر اعتراض پر ان کا جواب نہایت معقول ہوتا تھا۔

اعظم کے دیوان میں اردو غزلوں کا فقدان ہے، فارسی کی غزلیں زیادہ ہیں۔ نواب غلام غوث خان اعظم کی غزلوں کا بھرپور جائزہ علیم صبا نویدی نے اپنی کتاب ''تمل ناڈو کے مشاہیر ادب'' مطبوعہ ۱۹۹۹ء میں لیا ہے۔ یہ کتاب تمل ناڈو کے ادب پر تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

نواب محمد علی والا جاہ سے نواب غلام غوث خاں اعظم تک کے دور کو اردو زبان و ادب کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں اردو نے نہ صرف ترقی کی منزلیں طے کیں بلکہ مدراس میں آرکاٹ، ویلور، وشارم، ترچناپلی، آمبور، وانمباڈی، سلیم، مادورائی میں اپنا سکہ جما لیا تھا۔ یہاں کے شعرا اور ادبا کی اردو شاعری اور ان کے مطبوعہ دواوین آج بھی تمل ناڈو کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مندرجہ بالا علاقوں میں دینی موضوعات پر بھی مسلسل کام ہوا ہے اور اس کا مستند سرمایہ یہاں کے بعض بزرگ حضرات کے گھروں میں آج بھی قید ہے۔ دکھ اس بات کا ہے یہ بزرگ حضرات اس نایاب ذخیرے سے استفادہ کرنے کا موقع کسی کو نہیں دیتے۔ بحیثیت مجموعی تاریخ اردو ادب میں تمل ناڈو کی اردو خدمات ناقابل فراموش ہیں اور اس سے چشم پوشی اختیار کرنا یا سچائی پر غفلت کے پردے ڈال دینا ہمارے محققین اردو ادب کے صوبجاتی تعصب کی نمایاں دلیل ہے۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

محمد سمیع احمد

Opp Sir Syed Urdu Girls High School, Lodi Katra, Patna City 800008

اردو کے چند غزل گو شعرا: بخط خویش

اردو غزل کا تاریخی دور امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے۔ میر نے خسرو کی غزلوں کو نصف ہندی اور نصف فارسی بتایا ہے۔ غزل کا دوسرا دور دکن سے شروع ہوا۔ صوفیوں کی برکت سے غزل پروان چڑھی جسے سلاطین نے خوب سراہا۔ ولی دکنی اردو غزل کے پہلے غزل گو شاعر شمار ہوئے اور کافی شہرت پائی۔ اس دور کے مشہور غزل گو شعرا حاتم، میر اور سودا وغیرہ تھے۔

زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ غزل ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ دلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ اور فیض آباد وغیرہ میں عیش پرستی کا دور شروع ہوا۔ اس دور کے تحت جرات، انشا مصحفی، آتش اور ناسخ نے شہرت حاصل کی۔ دہلی میں غالب، ظفر اور مومن سے اس صنف میں نئی تبدیلی ہوئی۔ خصوصیت کے ساتھ غالب کے مفکرانہ انداز نے اردو غزل میں جو وقار لایا، وہ مثالی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد حالی نے اردو غزل کے قدیم انداز پر اپنی تنقیدیں پیش کیں اور عزیز اور آرزو لکھنوی کی شاعری سے غزل میں ایک نئی جان پیدا ہوئی۔

جدید دور میں حسرت، جگر اور اصغر وغیرہ نے نئے اور پرانے تجربوں سے غزل کو آراستہ کیا۔ یہ سلسلہ فیض، فراق اور جذبی تک رہا۔ ان فن کاروں کی تخلیقات ہی نہیں بلکہ ان کے عکوس تحریر بھی زمانے کے لئے یادگار ہیں اور بلاشبہ ابتدا سے ہی اہل ذوق ایسی یادگاریں مہیا کرنے اور جمع کرنے کے عادی رہے ہیں۔

شخصی تحریریں ایک نہیں ایک لحاظ سے کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ بخط فن کار، گویا فن کار کے جذبات، نظریات، اور تجربوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ اہم موضوعات پر معلومات میں بڑے بڑے اضافے ہوتے ہیں اور تحقیق کرنے والوں کو خصوصی حوالے ہاتھ آتے ہیں۔ اگر ایک طرف خودنوشت سوانح حیات کی بڑی اہمیت ہے تو دوسری طرف ان تحریروں کا مرتبہ بھی حد سے سوا ہے جو بخط فن کار ہوں۔ خصوصاً کسی شاعر کی تخلیق اس کی اپنی تحریر میں تحقیقی فیصلے کے لئے بنیادی ثبوت بن جاتی ہے اور پھر چونکہ تحریر کا شخصیت کی نفسیات سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اس لئے اس کے عکس ظاہر پر غور و فکر سے خاص مسرت و بصیرت ملتی ہے اور بہت سے نفسیاتی نکتہ تک پہونچنے کی راہ کھلتی ہے۔ اگر خودنوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے، جو فرد واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے، تو بخط خویش فن کار کی تحریر بھی اپنا خاص مقام رکھتی ہیں اور شان خط میں اس کے عہد کا رجحان بھی بتاتی ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ذیل کی سطروں میں چند غزل گو شعرا کا مختصر تذکرہ ان کے تحریری عکوس کے ساتھ حاضر کیا جا رہا ہے۔

(۱) یگانہ چنگیزی

پورا نام میرزا واجد حسین چنگیزی ہے۔ تخلص یگانہ ہے۔ ان کی پیدائش عظیم آباد (پٹنہ) کے مغل پورہ محلہ میں غالباً ۱۳۰۱ھ میں ذی الحجہ کی کسی آخری تاریخ کو ہوئی۔ ان کا نسبی سلسلہ چنگیز تک جاملتا ہے۔ ان کے نانیہالی بزرگ لکھنؤ سے عظیم آباد آکر سکونت پزیر ہوئے۔

یگانہ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ حسرت عظیم آباد میں ہوئی۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سے فراغت کے بعد ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسیٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ شعر و شاعری میں اصلاح سخن کے لئے سب سے پہلے مولوی سید علی خان صاحب بیتاب عظیم آبادی سے رجوع ہوئے۔

یگانہ نے سید محمد شاد سے بھی فیض حاصل کیا۔ ۱۹۰۴ء میں کلکتہ اور مٹیا برج میں قیام کیا جہاں محمد علی شاہ بہادر کے مرشدوں یعنی یعقوب

PDF Compressor Free Version

علی مرزا اور یوسف علی مرزا کے معلم رہے۔ آب وہوا موافق نہ رہنے کی وجہ کر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

عظیم آباد کی جائیداد فروخت کر کے لکھنؤ میں عیش وآرام کی زندگی بسر کرتے ہوئے ۹ر فروری ۱۹۵۶ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ نمونہ تحریر میں مرقومہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۱ء حاضر ہے۔

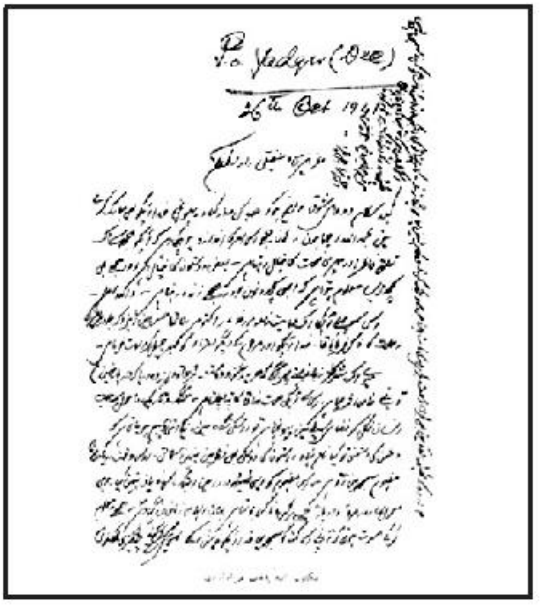

(۲) آرزوؔ لکھنوی

تخلص آرزوؔ کے ساتھ سید انور حسین عرف منجھو سے مشہور تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ ہرات سے ہندوستان بہ عہد اورنگ زیب آئے۔ آرزوؔ کو کم سنی ہی سے شعری ذوق تھا۔ تیرہ سال کی عمر سے استاد جلال الدین کی شاگردی اختیار کر لی۔ استاد نے آرزوؔ کے مشق سخن کی تیزی کا احساس کرتے ہوئے شاگردوں کی غزلیں اصلاح کے لئے ان کو ہی دے دیتے تھے۔ استاد کی موت کے بعد آرزوؔ ہی اپنے استاد کے جانشیں ہوئے۔

آرزوؔ کے تین دیوانوں میں ''فغان آرزوؔ'' کے تحت ۱۵ سے ۳۵ سال تک کی غزلیں شامل ہیں۔ ''جان آرزوؔ'' میں اس کے بعد کی غزلیں ہیں جب کہ ان کی ''سریلی بانسری'' میں تیسرے دور کی شاعری ہے۔

آرزوؔ کی ملازمت اہل سیف میں ہوئی اور اجمیر میں قیام پزیر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد لکھنؤ میں بود وباش اختیار کر لی۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۵۱ء کو انتقال ہو گیا۔ بخط شاعر ان کی خود نوشت غزل کا ایک نمونہ دیکھا جا سکتا ہے۔

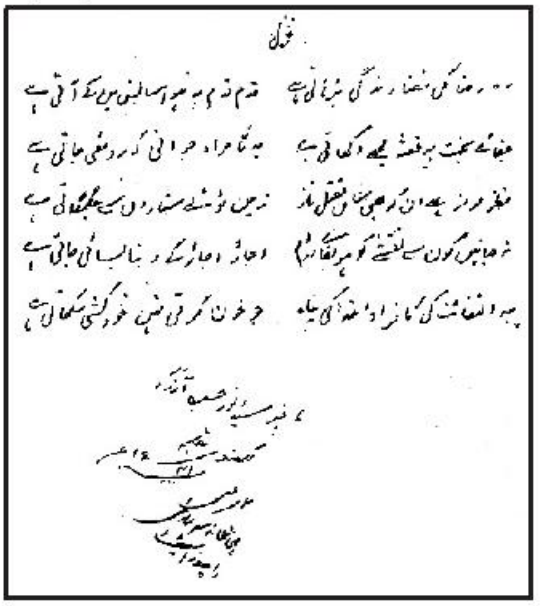

(۳) وحشتؔ کلکتوی

رضا علی وحشتؔ متحدہ بنگال کے اہم اور معروف شاعر تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸ر نومبر ۱۸۸۱ء میں شہر کلکتہ میں ہوئی۔ ان کا شمار صف اول کے غزل گویوں میں ہوتا تھا۔ ان کے مداحوں میں حسرتؔ اور اقبالؔ کا نام قابل ذکر ہے۔

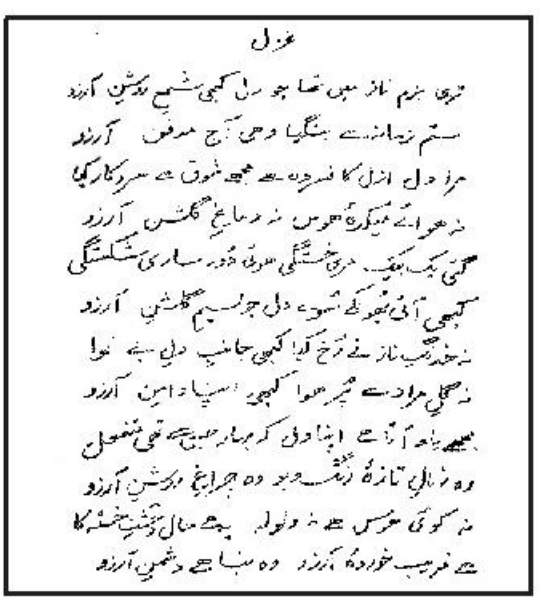

PDF Compressor Free Version

وحشتؔ نے ہر چند مرزا غالبؔ کے رنگ سخن کا اتباع کیا، مگر انہوں نے اپنے کلام کے انفرادی رنگ و آہنگ کی وجہ کر ہی شہرت پائی۔ وحشتؔ کو اہل بنگال "طوطیٔ بنگال" سے خطاب کیا کرتے تھے اور یقیناً اس خطاب کی قبا ان پر راست آتی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ان کا دیوان شائع ہوا جس میں فارسی کلام بھی شامل ہے۔ وہ اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۳۱ میں انہوں نے خان بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ رضا علی وحشتؔ کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ خودنوشت تحریر کا نمونہ شامل مقالہ ہے۔

(۴) جوشؔ ملیح آبادی

اصل نام شبیر حسین خان اور تخلص جوشؔ ہے۔ ان کی پیدائش ملیح آباد میں ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ جوشؔ بارہ سال کی عمر سے ہی شعر و شاعری سے ذوق رکھتے تھے۔ ابتدا میں عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جوشؔ کے کئی دیوان شائع ہوئے۔ اپنی شاعری کی وجہ سے انہوں نے کافی شہرت پائی۔ جوشؔ کی خودنوشت "یادوں کی بارات" بھی مشہور ہے۔ ان کی نثر بھی اپنا خاص جلوہ رکھتی ہے البتہ ان کی اصل شہرت شاعری سے ہی ہے۔

جوشؔ کے جد امجد نواب فقیر محمد خان، ان کے دادا نواب محمد خان اور والد نواب شبیر الدین خان بھی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کے

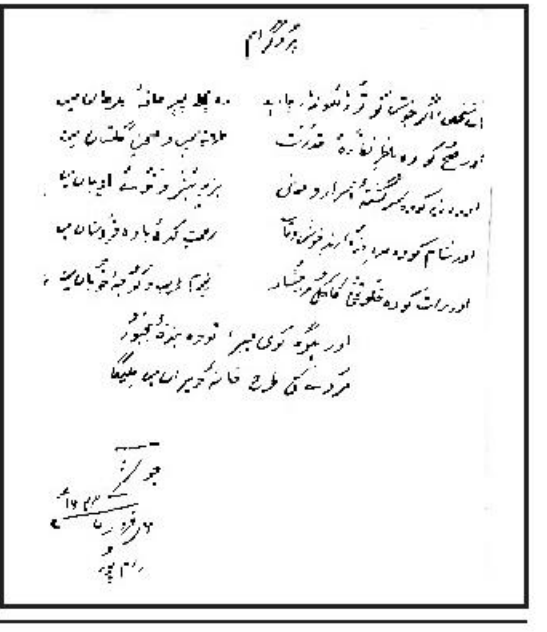

بزرگ کابل سے آکر کافی عرصہ تک قائم گنج ضلع فرخ آباد میں مقیم رہے، پھر ملیح آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ جوشؔ کی تاریخ وفات ۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کا زمانہ پانے والے نامور شاعروں میں جوشؔ کو بھلایا نہیں جا سکتا یہ ٹھیک ہے کہ ان کے یہاں گھن گرج کی کیفیت ملتی ہے، لیکن ان کی شاعری میں جو طنطنہ اور تراکیب کا جو حسن اور انوکھا پن ہے وہ پڑھنے والوں سے پسندیدگی کا خراج ضرور حاصل کر لیتا ہے۔ ان کی خودنوشت تحریر کا نمونہ دیکھا جا سکتا ہے۔

(۵) پنڈت برج موہن دتاتریا کیفیؔ

کیفیؔ کے آبا و اجداد کشمیر سے بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں دہلی پہنچے۔ ان کے والد کنہیا لال، راجہ بھرپور سنگھ کے دور حکومت میں ناتھ نامی مقام پر کوتوال رہے۔ کیفیؔ کی پیدائش ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں ہوئی۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ دہلی میں حکیم پورے والے کے مطب سے منسلک مدرسہ میں کیفیؔ کی بسم اللہ ہوئی۔ کالج سے فراغت کے بعد ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۵ء میں یورپ کا سفر کیا۔ یورپ میں علما اور ادیبوں سے

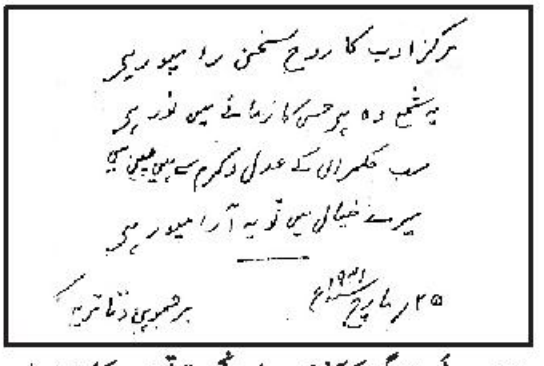

ملاقات ہوئی۔ زندگی کے آخری دور میں انجمن ترقی اردو کے کاموں میں مولوی عبدالحق کی مدد کرتے رہے۔ خودنوشت تحریر کا نمونہ دیا جا رہا ہے۔

(۶) صفیؔ لکھنوی

پورا نام سید علی نقی اور تخلص صفیؔ تھا۔ کلام ترنم سے پڑھنے کا خاص طریقہ تھا۔ ان کی مثنوی "تنظیم الحیات" پر ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد نے اعلیٰ نمونہ شاعری کے لئے مبلغ پانچ سو روپے عطا کیا۔ قومی نظموں کے اعتراف میں "لسان القوم" کا لقب دیا گیا۔ اردو کلام کے علاوہ فارسی شاعری کا خاصا مجموعہ ہے۔

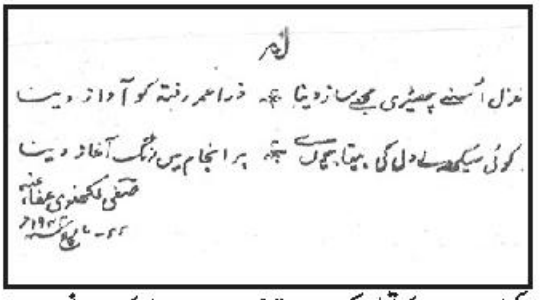

صفی کی پیدائش ۳؍جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ مولوی نجم الدین کاکوروی اور مولوی احمد علی محمد آبادی سے عربی اور فارسی کا درس

مکمل کیا۔ طب کی تعلیم حکیم سید باقر حسین سے حاصل کی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد جون ۱۸۸۳ء میں اودھ محکمۂ دیوانی میں مستقل ملازمت کرتے ہوئے ۱۹۲۲ء میں سبک دوش ہو گئے۔ ان کے والد مولوی سید فضل حسین، آخری تاجدار اودھ کے شاہزادہ سلیمان قدر بہادر کے معتمد تھے۔ صفی کی خودنوشت تحریر کا نمونہ شامل مضمون ہے۔

قرۃ العین حیدر کی افسانوی کائنات (ص ۷ سے آگے)

کردار اور ہزاروں کہانیاں شامل ہوتی چلی گئیں۔

اپنے انوکھے اسلوب اور داستانی طرز بیان پر عینی کو قدرت کاملہ حاصل تھی۔ وہ اپنے مخصوص اسلوب اور طرز بیان کی موجد بھی تھی اور خاتم بھی۔ فکشن میں داستان گوئی کا فن ان کے ساتھ ہی رخصت ہوا۔ ان پر ایلیٹ کلاس والوں کی کہانی لکھنے یا بورژائی فکر رکھنے کا الزام لگانا غلط ہے، کیونکہ ان کی بیشتر کہانیوں میں دونوں طرح کے کردار گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی اعلیٰ شخصیت ہی تھی کہ مصوری کے میدان میں قدم رکھا تو لندن میں ان کی پینٹنگس کی نمائش ہوئی۔ لکھنؤ گھرانے سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو پاکستان سے لندن اور امریکہ تک نئی دنیاؤں کو فتح کرتی چلی گئیں۔

پاکستان جانے کے بعد ہندوستان کی شہریت حاصل کرنی چاہی تو وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو تک آگے کھڑے نظر آئے۔ وہ ایک ایسی سے لی بریٹی تھیں، جس کے لیے ایک بڑی دنیا اور حکومت کرنے والوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور اسی لیے افسانوں سے ناول تک کردار و واقعات کا جو ہجوم یا سرمایہ ان کے پاس تھا، وہ کسی کے پاس نہ تھا۔ کردار و واقعات کو دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کا جو صحافتی اور سیاسی شعور ان میں تھا، وہ وسیع مطالعہ، مشاہدہ کی دین تھا اور ان میں ان کی سیر و سیاحت کو بھی دخل تھا۔ جو عالمی شہرت انہیں حاصل ہوئی، یہ اعزاز بھی ہر کسی کو نہیں ملتا۔

ان سب کے باوجود ایک سطح ایسی ہے جہاں وہ مجھے کمزور نظر آتی ہیں۔ ان کے بیشتر نسائی کردار کمزوری کی علامت ہیں۔ وہ عورتوں کو حرافہ، چڑیل، قطامہ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ''ہاؤسنگ سوسائیٹی'' میں کھلے خیالوں والی ثریا کا جمشید کے ساتھ جانا یا پھر ''سیتا ہرن'' میں سیتا رام چندانی کا آخر میں کسی مرد کے لیے مجبور ہونا محض کہانی کی مانگ نہیں ہو سکتی، یہ کہنا بھی مناسب نہیں کہ ایسی عورتیں ہمارے معاشرے میں ہر جگہ مل جاتی ہیں۔ ''جلا وطن'' کہانی میں یہ مکالمہ دیکھیے۔ ''لڑکیوں کی عجب بیہودہ قدم ہے۔'' اس سلسلے کو آگے بڑھایئے تو نہ وہ ممتاز شیریں سے خوش تھیں نہ پروین شاکر سے۔ قرۃ العین حیدر کے لفظوں میں کہوں تو دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ کردار و واقعات کے نفسیاتی تجزیے کے نام پر وہ ناراض ہو جاتی تھیں، اس لیے اس مضمون میں شروع سے آخر تک میں نے کہیں بھی علم نفسیات پر گفتگو نہیں کی، لیکن بہرحال اس نکتہ کو علم نفسیات سے ہی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نام نمود، شہرت، عزت، پیسہ سب کچھ تھا ان کے پاس، مگر زندگی ادھوری تھی۔ ناول سے افسانوی کائنات تک ان کی داستان گوئی میں یہ ادھورا رنگ صاف نظر آتا ہے۔

☆ جس سے تم نفرت کرتے ہو اس سے ڈرتے رہو

☆ جو اپنا راز چھپاتا ہے وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے

☆ آدمی کی قابلیت زبان کے نیچے چھپی ہوتی ہے

☆ شرک کے بعد بدترین گناہ مخلوق کو ستانا ہے

☆ دولت انسان کو گمراہ نہیں کرتی بلکہ اس کا غلط اور بیجا استعمال اسے گمراہ کر دیتا ہے۔

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر محمد بشیر الدین

Chishtipur, Asthawan, Nalanda 803107 (Bihar)

زبان: فطری ارتقا اور ادغامی اثرات

لسانی عروج وارتقا کا انحصار قومی، تہذیبی اور معاشرتی عوامل سے وابستہ ہے۔ یہ وابستگی یا پھر اس کی نمود و بالیدگی معاً دفعتاً کی متمنی و متقاضی نہیں بلکہ مختلف مراحل کے بعد ہی اس کی تشکیل ہوتی اور پھر رفتہ رفتہ آرائش وزیبائش کی صفت سے آراستہ ہوتی ہے۔ دنیا کی تمام تر ترقی یافتہ زبانیں بولی کے بطن سے پھوٹی ہیں، ان میں اردو جو سب کی چہیتی اور منھ بولی ہے اپنی خاص اہمیت رکھتی ہے، زبان چونکہ بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے، لہٰذا اس کی ابتدا بولی سے ہوتی ہے اور تحریر میں حرفوں کی باہمی ترتیب سے وہ تشکیل پاتی ہے، صوتی ترتیب و تنظیم (Phonetic system) سے معنی پیدا ہوتے ہیں، تبدیلی حروف سے پوشیدہ سروں (Rythms) کا مزاج ہی درہم برہم ہو جائے گا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ صوتی نظام میں وہ زلزلہ آجائے گا کہ حروف کی شناخت ہی غیر ممکن ہو جائے گی۔

ابتدائے آفرینش میں تبادلہ خیالات ایک اہم مسئلہ تھا۔ اردو کی ایک کہاوت ہے ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' یا علم طبیعات (Physics) کا اصول ہے کہ:

''Liquid Seeks its own Level''

''رقیق مادہ اپنی سطح آپ ڈھونڈ لیتا ہے۔''

زبان یا بولی کی ابتدا اسی اصول یا امر کی مرہون منت ہے، اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ زبان تبادلہ خیالات کا ایک اہم ذریعہ ہے، جو حیوان و انسان کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے۔ نطق یا گویائی (Speaking power) دونوں کو فطری طور پر ودیعت کر دی گئی ہے۔ دونوں یکساں آواز نکالتے ہیں، لیکن معنی ومفہوم میں ہر حال تفاوت برقرار ہے۔

قدرے اختلاف واعتراض کے باوجود ماہرین لسانیات کا اس امر پہ اتفاق ہے کہ اردو کا ماخذ ومنبع برج بھاشا ہے، جو خالص اردو زبان ہے، یہ بات الگ ہے کہ دونوں کے مابین ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بہن کا ہے، لیکن رشتہ تو ہے اور جب ہے تو کوئی نام بھی ہوگا۔

زبان کی روح رسم الخط میں ہی لپٹی ہوتی ہے اردو کے ساتھ کاٹ چھانٹ کا سخت مرحلہ یعنی اصلی صورت بگڑنے کی کیفیت بھی دیگر زبانوں سے قدرے زیادہ ہے۔ بعض حروف تو بالکل غائب ہی ہو جاتے ہیں، محض شوشے اور نقطے سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً غیبت (غ، ی، ب، ت) اس کی تحریری صورت کچھ حد تک اختصار نویسی (Short hand) کے مشابہ ہے۔ محض مشابہت ہی نہیں بلکہ اس میں باضابطہ فنی نظام کا استحقاق بھی ہے۔

اردو دراصل جدید ہند آریائی کی ایک علامت بن کر ابھری ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کی نشو ونما دو عظیم تہذیبوں کے سنگم سے ہوئی ہے، بلکہ یہ ان کی امٹ نشانی بھی ہے۔ اسے محض ایک زبان ہی نہیں ہندو مسلم تہذیبی اتحاد کی بنیاد بھی سمجھنا چاہیے۔ یہ ہندوستان میں تعمیر قومیت و جمہوریت کی سنگ بنیاد میں خشت اول کا رول ادا کرتی ہے۔ یہ وقت کی ایک نادر مہر ہے، جو تاریخ کی پیشانی پر لگا دی گئی ہے، جو ہمیشہ تابناک و درخشاں رہے گی۔ سر جدوناتھ سرکار نے اپنے ایک مضمون "Islam in India" میں لکھا ہے:

''مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوستان کو بہت ساری نعمتوں میں ایک بڑی نعمت زبان کی بھی ملی، جو ہندوستان میں Common language کہلانے کی مستحق ہے۔''

یا پھر ڈاکٹر تاراچند کے مطابق:

''اٹھارہویں صدی تک ہندو مسلمان دونوں اردو ہی کو

PDF Compressor Free Version

اپنی مشترکہ زبان سمجھتے تھے۔"

مطلب یہ کہ مختلف عہد میں مختلف ناموں مثلاً ہندی، ہندوی، ریختہ، زبان دہلی، اردوئے معلیٰ اور ہندوستانی وغیرہ ناموں سے یہ جانی پہچانی گئی۔ اردو کی خصوصیت یہ ہے کہ تحریر میں لفظ کی ساخت (Structure) یعنی ڈھانچہ محض مصمتوں (Consonents) سے بنتا ہے۔ مصوتے (Vowels) ساخت کے اندر گھسے ہوئے نہیں ہوتے، بلکہ حروف کے اوپر یا نیچے الگ سے لگا دیے جاتے ہیں۔ اس بنا پر اعراب کی عدم موجودگی سے بھی پڑھنے میں کوئی دشواری در پیش نہیں ہوتی۔ یہ وہ لسانی صفت ہے، جس سے ناگری محروم ہے۔ یہ صرف اور صرف اردو سے ہی مختص ہے اور پھر یہ کہ ہندی اردو کے مقابلے میں تمام آوازیں نکال ہی نہیں سکتی یہ اس بنا پر کہ ہندی میں بعض آوازوں کے لیے حروف ہی نہیں تو پھر آواز نکالنا کیوں کر ممکن ہو، مثلاً ث، ح، خ، ذ، ز، ژ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق اور ے۔

اردو کا مسئلہ بنیادی طور پر تہذیبی و لسانی ہے اور اس کا حل بھی انہیں حدوں میں تلاش کرنا مفید و مناسب ہوگا، کیونکہ زبان کی ترویج و ترقی کا راز مسلسل خدمت، ایثار و قربانی میں ہی پوشیدہ ہے۔ اس کا لازمی جز غیر جانب داری بھی ہے، محض سرکاری امداد و قانون بنانے سے زبان زندہ نہیں رہ سکتی، اس کے لئے عملی اقدامات ناگزیر ہیں، وقت کا تقاضا ہے کہ تاریخ کے آئینے میں ثابت کیا جائے کہ اردو زبان خالص ہندوستانی ہونے کے علاوہ ہندو مسلم بین تفاعل کا نتیجہ ہے۔ بین تفاعلی مطالعہ (Interactional Study of urdu language) سے اردو کی اہمیت و افادیت اجاگر ہو جاتی ہے۔

"Nobody is perfect" یعنی اس دنیا میں کوئی شئے اپنے آپ میں مکمل نہیں، یہ امر زبان کے ساتھ بھی لاحق ہے، کوئی بھی ایسا رسم الخط ایجاد نہیں ہوا جو دنیا کی تمام زبانوں کی تمام آوازوں کو صحت کے ساتھ مکمل طور پر ادا کر سکے۔ محض اردو ہندی کو ہی مورد الزام ٹھہرانا کسی بھی نقطہ نظر سے جائز نہیں۔

زبانیں فطری ارتقا و ادغامی اثرات کی قائل ہیں۔ "ادغام" عربی لفظ ہے، جس کے معنی ایک جنس کے دو حرفوں کو آپس میں ملا دینا (Duplication of letter by tashdid) ہے۔ ایک دوسرے میں ملے حرف کو مدغم (Merged) کہا جاتا ہے۔ ملانے کا کام تشدید کرتی ہے۔ مثلاً ایک جنس کے دو حرفوں کو لکھنا ایک مرتبہ اور پڑھنا دو مرتبہ۔ یہ حرف مشدد کہلاتا ہے۔ جیسے تکلف کا لام۔

تبدیلی عین فطرت ہے، لہٰذا زبان کا فطری ارتقا بھی ناگزیر ہے، صوتی تشکیل، تغیر و تبدل اور ادغامی اثرات فطری ارتقا کے تابع ہیں۔ زمان و مکان (Time & space) کے احوال و اطوار کے اعتبار سے زبان تغیر و تبدل کا شکار ہوتی ہے اور اسی عمل کو فطری ارتقا کہا جاتا ہے۔

زبان کی تاریخ میں صوتی تبدیلی و ارتقا کو سب سے زیادہ اہمیت اس بنا پر دی جاتی ہے کہ زبان کی دیگر تبدیلی اور ارتقا کم و بیش اکثر اسی کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور صداقت بھی ہے کہ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے۔ (Language is Collection of Sound) یہ اظہار خیال یا ترسیل و ابلاغ کا ایک ترقی یافتہ ذریعہ ہے۔ اسی نے حیوانیت کے عمیق غار سے انسان کو نکالا جو اشرف مخلوق کہلاتا ہے۔

زبان میں ایک قوت ہوتی ہے، جسے انجذاب (Alesorption) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انجذابی قوت زندہ و متحرک زبان کی علامت ہوتی ہے۔ اس بنا پر دوسری زبانوں کے الفاظ و اصوت کو وہ اپنے میں سمو لیتی ہے اور پھر اپنائیت کا ایسا لیبل چسپاں کر دیتی ہے کہ دوئی کا تصور معدوم ہو جاتا ہے۔ عربی و فارسی کے الفاظ کے حرکات و سکنات اور صورت میں جو تبدیلی آئی ہے وہ اردو کے مزاج اور لہجے کے اقتضا سے اپنے آپ عمل میں آئی ہے، جو فطری ارتقا کا مظہر ہے۔ اسی عمل سے زبان نکھرتی ہے، پروان چڑھتی ہے، جو زبان اس قوت و صلاحیت یا پھر استطاعت سے محروم ہوتی ہے وہ فروغ و ارتقا کی نعمت سے سرفراز نہیں ہوتی گویا وہ مردہ ہو جاتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کے مطابق:

> "لفظ خواہ کسی قوم و ملک کے ہوں، مگر جب دوسری قوم اور ملک کی زبان میں چلے جاتے ہیں تو ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے، جو پیدا تو کہیں ہوئے ہوں، لیکن جس ملک میں وہ بس گئے ہیں اسی ملک کے قوانین کا انہیں پابند ہونا پڑے گا۔"

یہی پابندی زندہ زبان عائد کرتی ہے، جو اس کی بقا کی ضمانت ہے، جو لفظ اردو میں آیا وہ اسی کا ہو کر رہ گیا خواہ وہ عربی ہو، فارسی ہو، انگریزی ہو، ترکی، یورپی، سریانی یا پنجابی ہی کیوں نہ ہو۔ اصل کے اعتبار سے صحیح ہو یا غیر صحیح۔ اس کی صحت اور اغلاط کا انحصار اردو میں رواج پکڑنے پر ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا بھی اس امر سے اتفاق ہے، وہ رقمطراز ہیں:

''غیر زبان کے جن الفاظ نے منجھ منجھا کر گھس پس کر یا
اختلاف لہجہ یا دوسرے اسباب سے ایک خاص صورت
اختیار کر لی ہے وہ اب اردو کے لفظ ہو گئے ہیں، انہیں
اصل زبان سے کچھ تعلق نہیں رہا۔''

اردو ہی کیا، انگریزی زبان میں بھی سینکڑوں الفاظ لاطینی، یونانی، عربی اور سنسکرت سے آئے ہیں، جن کے تلفظ و معنی میں تصرف کا استحقاق اہل زبان کو ہے۔ زبان کی تخلیق سے متعلق میکسم گورکی کا قول شاہد فیصل ہے۔ اس کے مطابق:

''زبان عوام نے تخلیق کی ہے۔''

مطلب یہ کہ کسی فرد یا خاندان کی میراث نہیں۔ عوام کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں درپیش دشواریوں نے زبان کو جنم دیا، جو بتدریج ارتقائی منازل طے کرتی آ رہی ہے۔ صوتی تبدیلی کی کئی وجوہات ہیں۔ عضویاتی تغیر ان میں بے حد اہم ہے۔ یہ تغیر ہمسایہ زبان کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، جب اجنبی زبان والوں سے سابقہ پڑتا ہے تو اس کی آوازیں لفظوں کو متاثر کرتی ہیں۔ عمل ورد عمل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، مخارج تلفظ رفتہ رفتہ اپنی جگہوں سے ہٹنے لگتے ہیں۔ اردو زبان کے مخفی حرف جر (Preposition, Genitive Case 'Kasrah' حالت اضافی at the end of word) ''سے'' کو ہی دیکھا جائے تو اس کی تبدیل شدہ صورت کن کن مرحلوں سے گزری ہے، پہلے یہ ''سیں'' یا ''سوں'' کی شکل میں مروج تھا۔ ولی دکنی کے عہد میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ولی سے قبل ''ستے'' اور ''ستیں'' کی شکل میں موجود تھا۔ ابھی ''سے'' کی شکل میں موجود ہے نہ جانے آگے چل کر اس کی صورت کیا ہوگی۔

صوتی ارتقا اور تبدیلی باضابطہ اور بے ضابطہ بھی ہوتی ہے، باضابطہ وہ ہے، جو ماہر لسانیات کے قواعد و قانون کے تابع ہے۔ آریائی لسانیات کے ماہرین واقف ہیں کہ سنسکرت کے ابتدائی حرف ''و'' نے اردو، بہاری، بنگالی اور اڑیا میں ''ب'' کی صورت اختیار کر لیا ہے یا پھر یہ کہ اردو کے بیشتر الفاظ کا ابتدائی حرف ''ب'' پہلے ''و'' تھا، لیکن صوتی تغیر کے اصول کے تحت ''ب'' ہو گیا۔ ہر زبان میں کثرت سے ایسے الفاظ مل جائیں گے جن کے تلفظ میں بڑی تیزی سے تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ غیر طبعی تبدیلی حاصل کرنے والے الفاظ میں اکثریت ان کی ہوتی ہے، جو مخاطب کرنے کے لیے یا روزمرہ کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بے تکلف گفتگو میں ''مولوی'' کے تلفظ پر غور کیا جائے تو پتہ یہ چلے گا کہ یہ صوتی تغیر کی دو منزلیں طے کر چکا ہے۔ مثلاً مولی سے ملی۔ پہلی منزل میں دوسرا ''و'' اور دوسری میں پہلا ''و'' غائب ہو جاتا ہے۔ دوسری مثال انگریزی لفظ ''اسٹیشن'' کی دی جاتی ہے، جو عام بول چال میں ''ٹیشن'' تک پہونچ جائے، لیکن یہ تغیر کسی باضابطہ اصول کا پابند نہیں۔ ایک اور مثال جس میں قریب المخرج حروف صحیح ایک دوسرے کی شکل میں منتقل ہو جاتے ہیں، لفظ ''نمبر'' کی ہے غالب نے جسے لمبر میں تبدیل کر دیا۔

صوتی تغیر یک لخت نہیں ہوتا بلکہ باہمی اختلاط کا عمل ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔ گویا زبان مسلسل بدلتی رہتی ہے، بدلاؤ سے ہی بانکپن آتا ہے، باضابطگی آتی ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ کائنات کی تمام اشیا اسی کے تحت بنتی بگڑتی اور نکھرتی، سنورتی ہیں۔ تغیر سے تبدیل ہوتا ہے۔ لسانی عروج و ارتقا قوم و ملت، تہذیب تمدن اور ثقافتی سرگرمیوں کو پروان چڑھاتا ہے، دوئی کے تصور کو ختم کرتا ہے۔ یکسوئی عطا کرتا ہے۔ اپنائیت کو فروغ دیتا ہے۔ غیر جانب داری کو جلا بخشتا ہے اور اس کی پاسداری ہماری سالمیت کی بقا کا ضامن ہے۔

زبان و ادب کی قیمت میں اضافہ

آئندہ ماہ (اکتوبر) سے ''زبان و ادب'' کی قیمت میں ہلکا سا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب رسالے کی قیمت فی شمارہ پندرہ روپے ہوگی اور زر سالانہ ایک سو پچاس روپے ہوگا۔ ایجنٹ اور خریدار حضرات نوٹ فرمالیں۔ (سرکولیشن مینیجر)

PDF Compressor Free Version

حسن جہاں

Qazi Masood House, Khaitan Market, Birla Mandir Road, Patna

منٹو کی فنکارانہ عظمت

سعادت حسن منٹو اردو افسانہ نگاری کے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پریم چند کے بعد جس ایک افسانہ نگار کو سب سے زیادہ داد ملی اور کم وقت میں جس نے اپنی صلاحیت سے سب سے زیادہ بہترین افسانہ لکھے، وہ سعادت حسن منٹو کے سوا شاید کوئی اور نہیں۔ منٹو کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز وکٹر ہیوگو کے "Less,"Last Days of Condemned"Miserable" اور آسکر وائلڈ کے ڈرامے ''ویرا'' کے ترجمے سے ہوئی۔ ادبی دنیا میں منٹو کی شناخت اگر چہ اپنے افسانوں کی وجہ سے ہے، لیکن اس کے علاوہ منٹو کے ناول، ڈرامے، مضامین اور خاکے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ فلمی دنیا سے بھی ان کا تعلق رہا اور بہت ساری فلموں کی کہانی، مکالمے یا منظر نامے انہوں نے قلم بند کیے۔

منٹو نے ناول صرف ایک ہی لکھا ''بغیر عنوان کے'' لیکن ان کے ڈرامے بڑی تعداد میں ہیں۔ انہوں نے تقریباً سو ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ ابتدائی ڈراموں کے مجموعے ''تین عورتیں'' اور ''آؤ'' ہیں۔ ''کروٹ'' اور منٹو کے کئی اور ڈرامے میں سسپنس اور فلمی انداز کی کہانیاں ملتی ہیں۔ منٹو کے بہت سارے ایسے ڈرامے ہیں، جو عام تفریح کی سطح سے بلند نہیں ہو پائے، البتہ ''اس منجدھار میں'' ان کا شاہکار ڈراما ہے۔

منٹو ایک باکمال خاکہ نویس بھی تھے۔ ''گنجے فرشتے'' اور ''لاؤڈ اسپیکر'' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ان میں بائیس شخصیتوں پر خاکے لکھے گئے ہیں، جن کا تعلق فلم، سیاست اور اردو ادب سے ہے۔ ان خاکوں کے مطالعے سے نہ صرف ان شخصیات سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ اس میں متعلقہ عہد کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔

خاکے اور ڈرامے کے علاوہ منٹو کے مضامین کی تعداد بھی کافی ہے۔ ''منٹو کے مضامین'' میں ۱۹۴۲ء سے پہلے کے مضامین شامل ہیں۔ ''اپنی نگریا''، ''چل چل رے نوجوان''، ''بیگم''، ''شکاری''، ''پڑوسن''، ''غالب''، ''گھمنڈ'' اور ''آٹھ دن'' جیسی فلمیں منٹو کے قلم سے نکلیں۔ ان میں کئی اپنے زمانے کی نہایت مشہور فلمیں ہیں۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ، مگر سچ یہ ہے کہ مختلف الجہات شخصیت کے مالک سعادت حسن منٹو اصلاً افسانہ نگار تھے اور ادبی دنیا میں افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا نام زندہ جاوید ہو گیا۔

منٹو کا پہلا افسانہ امرت سر سے نکلنے والے رسالے ''خلق'' اگست ۱۹۳۴ء کے شمارے میں ''تماشا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آتش پارے'' کے علاوہ جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا، ان کے افسانوی مجموعے ''دھواں''، ''منٹو کے افسانے''، ''نمرود کی خدائی''، ''سڑک کے کنارے''، ''برقعے''، ''پھندنے''، ''شکاری عورتیں''، ''سرکنڈوں کے پیچھے''، ''بادشاہت کا خاتمہ''، ''شیطان''، ''اوپر نیچے اور درمیان''، ''نیلی رگیں''، ''کالی شلوار''، ''بغیر اجازت کے''، ''رتی ماشہ تولہ''، ''یزید''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''بڈھا کھوسٹ''، ''خالی بوتلیں''، ''خالی ڈبے''، ''سیاہ حاشیے''، ''گلاب کا پھول''، ''چغد''، ''لذت سنگ''، ''تلخ، ترش شیریں'' اور ''جنازے'' وغیرہ بھی مشہور ہیں اور ان مختلف النوع تصانیف سے بہر حال منٹو کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد ترقی پسند نظریے کے تحت افسانے کا موضوع طبقاتی کشمکش اور سماج کے دیگر مسائل بن گئے تھے۔ اس وقت کے شاعر و ادیب کی تخلیقات پر شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کا اثر پڑ رہا تھا۔ کرشن چندر، بیدی اور عصمت بھی اس تحریک سے وابستہ ہو کر سماجی مسائل پر غور و خوض کر رہے تھے۔ فکری طور پر منٹو بھی اس طرف راغب ہوئے، لیکن اسے انہوں نے اپنے ذہن پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

PDF Compressor Free Version

منٹو کے عام موضوعات فرقہ وارانہ فسادات، جنسی ونفسیاتی مسائل، تقسیم ہند کا المیہ اور زندگی کے گھناؤنے پہلو ہیں۔ منٹو کے فن پر طرح طرح سے نکتہ چینی کی گئی اور ان کے افسانے ''بو''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''کالی شلوار''، ''دھواں''، ''کھول دو'' اور ''اوپر نیچے اور درمیان'' پر مقدمات بھی چلے، لیکن پلڑا منٹو کی طرف ہی جھکا اور انہیں سرخروئی حاصل ہوئی۔ فحش نگاری منٹو کی کمزوری ہے، لیکن جہاں ایک طرف یہ ان کی کمزوری ہے وہیں دوسری طرف یہ ان کی طاقت بھی ہے۔ جہاں انہوں نے مخفی رازوں کو بے نقاب کرنے کی غرض سے جنسی موضوعات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا، وہیں وہ ایک کامیاب حقیقت نگار کی شکل میں بھی ابھرے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی اور سماج کے تلخ تجربات کو پیش کیا ہے۔ اپنے افسانے کے بارے میں منٹو نے خود ہی کہا ہے:

> ''زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔'' (بحوالہ سعادت حسن منٹو، پریم گوپال متل، ص ۱۴)

منٹو کے انوکھے فن کی وجہ سے ان کی مدح و مذمت دونوں ہوئی۔ ان کے حصے میں داد و تحسین بھی آئی اور ہجو و تضحیک بھی۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں منٹو کا ہر گوشہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہے، جس میں کبھی ان کی شخصیت عظیم تر نظر آتی ہے تو کبھی کریہہ احساس سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم دونوں رخ دیکھیں تو یقیناً ہمیں منٹو کی شخصیت میں اعتدال نظر آئے گا۔ وہ شیطان ہیں اور نہ فرشتہ، وہ تو انسان ہیں، جس سے خیر و شر دونوں کی امید کی جاتی ہے۔

منٹو کے سیاسی افسانے ''نیا قانون''، ''۱۹۱۹ء کی ایک رات''، ''سوراج کے لئے'' اور ''یزید'' کافی اہم ہیں۔ منٹو نے رومانی افسانے بھی لکھے ہیں، لیکن یہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے، اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ خود منٹو کا ذہن رومان پسند نہ تھا۔ اس زمرے میں ''عشق حقیقی''، ''دو قومیں''، ''عشقیہ کہانی''، ''جاؤ حنیف جاؤ''، ''سودا بیچنے والی'' اور ''پشاور سے لاہور تک'' شامل ہیں۔ طوائف کی زندگی پر منٹو نے ایسی ایسی کہانیاں لکھیں ہیں، جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ''ہتک''، ''کالی شلوار''، ''دس روپے''، ''جانکی''، ''پہچان''، ''نو بھا بھائی''، ''شاردا''، ''سراج''، ''سوکینڈل پاور کا بلب'' اور ''سرکنڈوں کے پیچھے'' بلاشبہ اپنے موضوع پر فکشن کا شاہکار ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں فنی خصوصیات مثلاً کردار نگاری، پلاٹ، مکالمے اور زبان و بیان کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ محمد حسن عسکری نے منٹو کو ''موضوع اور ہیئت کا پیش رو'' کہا ہے۔ افسانے کے ضمن میں منٹو نے تمہید، وسط اور انجام پر بھی خاصی توجہ دی ہے۔ وہ تمہید سے خاص کام لیتے ہیں، اس کے ذریعہ کردار کا تعارف کراتے ہیں، کبھی کردار کی ذہنی، نفسیاتی اور داخلی کیفیت کو پیش کرتے ہیں، کبھی کہانی کے لئے ماحول تیار کرتے ہیں، کبھی موضوع سے واقف کراتے ہیں اور کبھی آنے والے واقعات کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں۔ غرض کہ ان کے افسانوں کی تمہید کئی جہات کی حامل ہوتی ہے، جو عموماً قاری کے ذہن پر چھا جاتی ہے۔ مثلاً ''نعرہ''، ''پھاہا'' اور ''پہچان'' کی تمہید دیکھی جا سکتی ہے۔ ''پھاہا'' کی تمہید صرف ایک جملے میں ہے:

> ''گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔''

قاری کے دل میں تجسس اور کردار کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنے کی خواہشیں پیدا کرنے میں منٹو پوری طرح کامیاب ہیں اور یہی کیفیت ان کی کہانیوں کے انجام سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً افسانہ ''ہتک'' کی سوگندھی کو دیکھئے کہ وہ کس طرح رخصت ہوتی ہے:

> ''بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھا لیا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔''

سوگندھی کے اس ردعمل کو قاری پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور اسے سوگندھی سے ہمدردی کا احساس ہوتا ہے۔ ''سجدہ'' کا انجام منٹو کی

PDF Compressor Free Version

منفرد خصوصیات کی عکاسی کرتا ہے، جہاں وہ چونکا دینے والے اور بعض اوقات انسانی سوچ کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے جملوں کے ذریعہ اپنے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ''بیگو'' کے انجام کے توسط سے قاری کا ذہن پورے افسانے پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ''نعرہ'' کے کردار کیشو لال کی جذباتی شدت اور اور اعصابی کشمکش کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ زندگی کی ٹریجڈی تلخ تر ہو جاتی ہے۔ یہ سعادت حسن منٹو کی جزئیات نگاری اور جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

منٹو اپنے افسانے کے وسط پر بھی خاص توجہ دیتے ہیں اور اس توسط سے مزید دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں آغاز، وسط اور انجام میں نہایت فنکارانہ تال میل پایا جاتا ہے۔

منٹو کے فن کو اگر زبان و بیان اور وسائل اظہار کے نقطہ نظر سے جانچنے، پرکھنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے وہ ان کا انداز بیان ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اظہار غیر معمولی انداز سے کرنا جانتے ہیں اور بعض دفعہ اہم اور گہری بات کو اس طرح ادا کر دیتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ خیال میں جدت و ندرت اور بیان میں سادگی منٹو کی تحریر کے اہم اوصاف ہیں، مثلاً ''نیا سال'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

''اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس دوسرے کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔''

مزید مثالوں کے لئے ''پہچان''، ''اس کا پتی''، ''بانجھ''، ''نعرہ''، ''قبض'' اور ''مصری کی ڈلی'' وغیرہ افسانے دیکھے جا سکتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ فکشن کی زبان اتنی سادہ اور شفاف ہو کہ اس کی خوبیوں کی طرف دھیان جانے کے بجائے قاری اس منظر یا کردار کو دیکھنے اور محسوس کرنے میں محو ہو جائے جو افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ منٹو واقعی ایسی زبان لکھنے پر قادر تھے۔ منٹو کی شخصیت کی طرح ان کے کردار بھی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اعصاب زدگی کا شکار سوگندھی اور بشن سنگھ ایسے کردار ہیں، جن کا انجام قاری کے اعصاب پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ بشن سنگھ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا مرکزی کردار ہے۔ یہ افسانہ تقسیم ملک کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، لیکن ہجرت اور فسادات کے موضوع پر لکھے گئے دوسرے افسانوں سے اس کا موضوع بالکل مختلف ہے کیونکہ اس میں قتل و غارت، خون خرابہ، عریانیت اور جنس کی عکاسی نہیں ملتی ہے بلکہ ملک کی تقسیم میں پیش آنے والے بے شمار مسائل میں سے ایک مسئلہ کو پیش کیا گیا ہے اور وہ مسئلہ سرحد کے دونوں طرف کے انسانوں کے تبادلے کا ہے۔

''ہتک''، ''موذیل''، ''نیا قانون''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''کھولدو'' جیسے افسانوں کا مطالعہ منٹو کے تصور کائنات کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے۔ منٹو اپنے کرداروں، بالخصوص خواتین کو زمانے کے جبر و استحصال کا شکار ثابت کرتے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور محبت، مساوات اور انصاف جیسی دائمی اقدار کا پاس ان کے یہاں سب سے زیادہ ہے۔ منٹو نے عورتوں کی بیچارگی اور جبر کی زندگی کی پیش کش میں جس سوز کا اظہار کیا ہے، وہ اردو افسانے کا ایک بہترین وقوعہ ہے۔

منٹو نے کم عمری میں دنیا چھوڑ دی، مگر اردو کو بہترین افسانوں کی ایک بڑی تعداد سے نواز کر گئے۔ بلاشبہ وہ اپنی موضوعاتی، فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی خوبیوں کی وجہ سے پریم چند کے بعد سب سے بڑے افسانہ نگار قرار دئے جاتے ہیں۔

فلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیق کے ساتھ اپنا نام جو آپ کے بینک اکاؤنٹ میں ہے، انگریزی میں ضرور لکھیں، ساتھ ہی بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFSC Code بھی تحریر کریں۔ اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ بھی انگریزی میں تحریر کریں تاکہ آئندہ آپ کے معاوضے کی رقم سیدھے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے اور آپ کو دشواری نہ ہو۔ اس اعلان کو خاص طور پر وہ سبھی فلم کار بھی نوٹ فرمالیں جن کا کسی بھی طرح کے لین دین کا تعلق بہار اردو اکادمی سے ہے۔

—— سکریٹری

PDF Compressor Free Version

افسانے

فیروز عابد

C/o Baitul Qasim, 12/3/H/1 - Patwar Bagan Lane, Kolkata 700009 (Mob. 09831247455)

نرم لہجے کا فسوں

''عجیب سناٹا ہے..... کہاں پھنس گیا.....؟''

''کیا ہوا.....؟''

''یہ کیسی خاموشی ہے، ابھی رات اتری بھی نہیں..... یہ کیسا گاؤں ہے؟''

''سناٹا ہے، تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیسا سناٹا، کیسی خاموشی؟''

''دیکھو گھروں کے کواڑ بند ہیں..... دھول سے اٹے تنگ راستے ہیں.....''

''تم ابھی سے گھبرا گئے، پورے گاؤں کے سروے میں کئی دن تو لگ ہی جائیں گے۔ دیکھو کھڑکیوں سے مدھم مدھم روشنی آرہی ہے۔ لوگوں نے گھروں میں چراغ، لیمو یا پھر لالٹین روشن کر لیے ہیں۔''

''کہاں پھنس گیا..... وحشت ہو رہی ہے۔ رکشا والا بھی عجیب تھا..... کہا، آگے راستہ تنگ ہے، سائیکل وین نہیں جا سکتا.....''

''اس نے غلط کیا کہا..... میں اور تم اور اگر کوئی تیسرا ہم سے قدم سے قدم ملا کر چلے تو پھر مٹی کے اوبڑ کھابڑ راستے میں گر جائے گا۔ رکشا والے نے کہا تھا بائیں طرف برگد کا درخت ملے گا۔ بس اس کے بغل سے نکل جانا..... کئی قدم کے فاصلے پر ان سارے مکانوں سے ذرا اونچا مکان ملے گا۔ وہی کھیا جی کا گھر ہے.....''

''کیا مصیبت ہے یہ سناٹا تو اور گہرا ہو رہا ہے.....''

''دوست سناٹا نہیں، اندھیرا اب گہرا ہو رہا ہے.....''

''رکو، بیگ سے ٹارچ نکالتا ہوں.....''

ٹارچ کی روشنی میں برگد کا درخت نظر آ گیا..... کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

''چلو راحت ملی..... برگد کے بغلی کنارے سے نکل پڑیں، بس کھیا جی کا گھر نظر آ جائے گا۔''

کھیا جی کے گھر میں شاید گیس لیمپ جل رہا تھا۔

''چلو تم ہی دستک دو''

''کون ہو بھائی.....؟''

''ہم لوگ شہر سے سروے کے لئے آئے ہیں.....''

''اچھا..... اچھا.....''

بھاری بھرکم کواڑ کا ایک پٹ ہی کھلا، کواڑ کھولنے والے نے کہا: ''آجائیے۔''

چھوٹے سے آنگن سے گزر کر ہم ایک اور کھلے ہوئے آہنی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ کھیا جی اپنی کرسی سے آدھے کھڑے ہوئے اور سامنے رکھی کرسیوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آپ لوگ دور سے چل کر آرہے ہیں۔ سانس ٹھیک کر لیجیے تو پھر باتیں کریں گے۔ ارے رام دیال ان کے تازہ دم ہونے کے لئے کنوئیں سے پانی نکال لیو اور وہ جو کمرہ ہے اس میں بستر لگا دیو..... آج آرام کر لیں۔ ہاں بتاشا پانی۔ چوڑا اور دودھ یہیں لے آئیو.....''

''آپ میرے نام کا کاغذ دکھا دیجیے۔ اچھا چھوڑیے، پہلے آپ لوگ فریش ہو جائیے۔''

کھیا کی شام کی ضیافت کے بعد نول شرما نے اپنے بیگ سے کھیا اور بی ڈی او کے نام کے خطوط نکالے۔ ''اس میں تو صرف ایک ہی نام ہے نول شرما، جو سروے کریں گے۔ آپ ہیں یا یہ.....؟''

''جی میں ہوں اور یہ میرے دوست سنیل رائے ہیں۔ میری درخواست پر میرے ساتھ چلے آئے۔ ہم دونوں نے ایک ہی یونیورسیٹی سے ایم۔ اے کیا ہے۔ میں نے ہندی میں اور انہوں نے پولٹیکل سائنس میں، میری نوکری لگ گئی۔ انھوں نے ابھی نوکری کے بارے میں سوچا نہیں ہے۔ یہ بس سماج سدھار کی بات کرتے ہیں۔''

PDF Compressor Free Version

سنیل رائے نے حیرت سے اپنے ڈرپوک دوست کو دیکھا۔

''بڑے اچھے اور شبھ وچار ہیں۔ سنیل بابو کے۔ چلئے آرام سے یہاں رہیے۔ ارے رام دیال، ان کا کمرہ ٹھیک کر دیا نا۔ جایئے آرام کیجیے۔ کل بات کرتے ہیں۔''

''ڈراور سناٹے کی بات کرنے والا نول کشور بہت بہادر ہوگیا۔ کیا بات ہے۔'' سنیل نے نول کو چھیڑا۔

''بھیا سنیل میں تو چلا سونے۔ تم اپنی انقلابی کتاب اس ٹمٹماتی روشنی میں پڑھو۔ موسم بہت خوش گوار ہے۔''

سنیل کیا سوچ رہا تھا یہ بتانا ذرا مشکل تھا، مگر اس کے چہرے پر امید بھی تھی اور نا اُمیدی بھی۔ وہ نول کے ساتھ یہ دیکھنے آیا تھا کہ اس گاؤں کے لوگ زندگی جی رہے ہیں یا جھیل رہے ہیں، ابھی وہ سوچ میں غرق ہی تھا کہ رام دیال کی آواز ابھری:

''بابو لوگن سو جایئے، کھیا جی کا آدیش ہے۔ لالٹین بجھا دیجیے گا۔''

نول سو گیا تھا، سنیل کی نیند اُڑ گئی تھی۔

''آدیش، کھیا کا آدیش۔''

بہت دیر رات گئے اس کی آنکھ لگی، مگر.....

''کیا ہوا سنیل کیوں چیخ رہے ہو۔ کہاں سناٹا ہے، کیسا سناٹا ہے؟'' سنیل کی آنکھوں میں درد و کرب کی پرچھائیاں تھیں۔

''تصویریں دھندلی ہوگئی ہیں۔ ہر طرف ہنگامہ تھا۔ خون ہی خون۔ بچے، جوان، عورتیں اور بوڑھے۔ پتہ نہیں کون لوگ تھے۔ لہو لہان۔ ہنگاموں میں سناٹا۔ شکستگی، خوف اور نسلوں کی تباہی کا سناٹا۔''

سنیل اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

''تم کھیا کے گھر کیوں آئے۔''

سنیل نے اچانک نول سے سوال کیا۔

''بی ڈی او کی طرف سے رہنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں کھیا جی سے مل لوں۔''

صبح ہوگئی تھی۔ شاید بچے بھی تنگ راستوں میں نکل آئے تھے۔ کھیا جی کے کارندے رام دیال نے ان کے نہانے دھونے اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیا تھا۔

کھیا جی اپنے کمرے میں سراپا انتظار تھے۔

''تو پھر کام شروع کر دیجیے۔'' کھیا جی نے کہا۔

''پہلے بی ڈی او صاحب سے مل لیں'' نول نے کہا

''کوئی ضرورت نہیں۔ اس گاؤں میں کل باون پھونس کی جھونپڑیاں ہیں۔ میرا مکان ان سے الگ ہے۔ آپ کہاں جائیں گے۔ یہاں بیٹھے آرام سے سروے رپورٹ تیار کیجیے۔''

''مگر کھیا جی یہ کیسے ممکن ہے۔'' سنیل رائے نے کہا۔

کھیا جی نے سنیل کی طرف غور سے دیکھا اور کہا:

''آپ نا ہی بولیں۔ یہ کام آپ کا نہیں آپ سروے بابو کے دوست ہیں، اس لیے آپ چاہیں تو گاؤں دیکھ لیں، گھوم لیں۔''

سنیل رائے اندر ہی اندر گھلتا رہا۔ ''اب کام شروع کریں سروے بابو۔ ہم آپ کو جھونپڑی نمبر ایک سے باون تک کے رہنے والے کے نام، پیشہ، ذات، دھرم اور ان کے اناج جیسے چاول، گیہوں، کراسن تیل وغیرہ اور سبھی کچھ جن کی خانہ پری کرنی ہے، بتا دیں گے۔''

سنیل نے ایک نظر کھیا جی پر ڈالا اور باہر نکل گیا۔ راستے میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے والے ایک بچے نے پوچھا:

''آپ کھیا کا کا کے متر ہیں..... گاؤں دیکھیں گے۔''

''ہاں۔'' وہ اس لڑکے کے ساتھ پھونس کے دور دیہ چھوٹے بڑے، ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو دیکھتا آگے بڑھتا رہا۔ باون جھونپڑیوں والے گاؤں میں نہ پیپل کا درخت تھا اور نہ نیم کا۔ ہر طرف خاردار جھاڑیاں، اچانک وہ ٹھٹھک کر رک گیا ان تمام مکانوں سے ذرا الگ باہر سے خوب صورت ایک مکان تھا۔ لڑکے نے بے ساختہ کہا:

''یہ ماسٹرنی دادی ماں کا گھر ہے۔ چلئے گا، بڑی اچھی ہیں۔''

''اندر جاؤ اور ان سے کہو شہر سے ایک آدمی آیا ہے، جو ان سے ملنا چاہتا ہے۔''

لڑکا اندر گیا اور اس کے ساتھ وہ خاتون دروازے تک آگئیں۔ ساٹھ سال سے اوپر ہوگی ان کی عمر۔ پر وقار متبسم چہرا۔ سبز کنارے کی سفید ساڑی۔ سر پر بہت سلیقے سے سجا پلو۔

سنیل نے نمسکار کیا۔ انھوں نے جواب میں اپنا ہاتھ اٹھایا

PDF Compressor Free Version

اور اندر آنے کی دعوت دی۔کافی کشادہ ، بڑا اور سجا سجایا کمرہ تھا۔ پیٹرومکس لیمپ جل رہا تھا۔انھوں نے بائیں طرف کا پردہ اٹھایا اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔کچھ دیر بعد ایک ٹرے میں دو گلاس شربت لے آئیں۔انھوں نے بہت اخلاق سے سنیل اور لڑکے کو گلاس پیش کیا۔لڑکا شرمایا، مگر انھوں نے اسے راضی کر لیا۔سنیل نے ان کا شکریہ ادا کیا اور شربت پینے لگا۔

''آپ اکیلی رہتی ہیں.....''

''ہاں میں اب تنہا ہوں، میرے ساتھ اس گاؤں کی ایک جوان بیوہ ہے، وہ میری ہمدرد و مددگار ہے۔''

''مگر آپ؟''

''میں پینشن یافتہ خاتون ہوں۔اپنے شوہر کے قتل کے بعد مجھے سروس کا آفر ملا، مگر بہت دور جانے کو کہا گیا، مگر اپنے شوہر کی یاد جو اس گاؤں سے جڑی ہے، اس سے دور جانا میرے لئے ناممکن تھا۔''

''مگر آپ کے شوہر کا قتل؟''

''وہ کسی اور بلاک کے بی ڈی او تھے۔انہیں اس بلاک کا بھی چارج دیا گیا تھا۔وہ معاشی بدحالی اور معاشرتی تصادم کی نہیں ایکتا کی بات کرتے تھے۔وہ اکیلے تھے، ہار گئے اور ایک دن ان کو قتل کر کے اسی گاؤں کے کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔جب سارا نظام ہی سڑ گل جائے تو پھر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔میں کہیں نہیں گئی۔''

''یہ تو پرولیا، بانکوڑہ اور بھوج پور کے گاؤں سے بھی زیادہ وحشی گاؤں.....''

یہ کہہ کر سنیل کانپ کانپ سا گیا۔

''میرا خیال ہے آپ ایک اچھے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔سسٹم اتنے الجھاوے والا ہو گیا ہے کہ اب نئے نظام کے بارے میں سوچنے سے بھی ڈر لگتا ہے۔آپ کی گفتگو سے متاثر ہوں۔جایئے اور زندگی سے مصافحہ کیجیے۔یوں اس طرح اس بے آب و گیاہ پھونس کے گاؤں میں مت گھومیے کہ یہاں کا سناٹا بہت ہولناک بھی ہو سکتا ہے۔ بیٹا میرا خیال ہے دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔مجھے ضروری فرض ادا کرنا ہے.....''

''آپ کا نام.....؟''

''میں ایک بیوہ خاتون ہوں۔آپ کی ماں جیسی ہوں۔یہی میری پہچان ہے، یہی میرا نام ہے۔''

سنیل نے ان کا شکریہ ادا کیا اور لڑکے کے ہمراہ دوسری طرف نکل گیا۔سنیل نے اس لڑکے سے بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔بس بے آب و گیاہ، دھول سے اَٹے تنگ راستوں پر گھومتا رہا۔ واقعی یہاں سناٹا ہے۔ٹھیک کہا تھا نول نے، مگر ایسا سناٹا کیوں۔کیسا ڈر، کون سا خوف؟ وہ بڑبڑاتا گیا اور چلتا رہا۔برگد کا ایک ہی درخت نہ پیپل اور نہ نیم کا درخت، نہ کتے اور نہ بلیاں۔وہ بے مقصد اِدھر سے اُدھر گھومتا رہا۔آخر کب تک.....اس نے کھیا جی کے دروازے پر دستک دی۔رام دیال نے دروازہ کھولا۔نول کاغذات سمیٹ رہا تھا۔کھیا جی کرسی پر براجمان تھے۔

''کہیے سنیل جی ہمارا گاؤں کیسا لگا؟ دیکھا آپ نے سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔کہیں کوئی ہنگامہ فساد اور لڑائی جھگڑا نہیں۔ہم ہیں نا۔''

کھیا کی آواز میں کھوکھلا پن تھا۔سنیل کو رام دیال نے کمرے تک پہنچا دیا تھا۔اس نے رات ہی میں نول کے پاور بینک سے اپنے موبائل کو چارج کر لیا تھا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے نول سے کہا کہ وہ جا رہا ہے۔ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں، پتا جی بہت پریشان ہیں۔پریشان کیوں نہ ہوں۔ ان کا اکلوتا بیٹا ان سے دور دوسروں کے دکھوں پر مرہم لگانے جہاں تہاں بھٹک رہا ہے۔اسے کہیں بھی کامیابی نہیں ملی۔زندگی جھیلنے والوں نے زندگی جینے کے اس طریقے کو مسترد کر دیا۔وہ سسک پڑا:

''پانچ سال سے میں اپنے اندر کی آواز کو دور گاؤں گاؤں لے جاتا رہا، مگر زندگی جھیلنے کے طریقے کو ہی لوگوں نے جینے کا شعار بنا لیا۔یہاں تمہارے ساتھ آیا تو پہلی بار لرز گیا۔باون پھونس کی جھونپڑیوں کے اندر کا دکھ اور کرب مجھے معلوم نہیں، مگر کل شام کھیا کے دروازے کے باہر ایک پرانے ماڈل کی موٹر بائیک اور اس کے گھناؤنے چہرے والے سوار نے مجھے اندر سے توڑ دیا۔اسی وقت وہ خاتون یاد

(بقیہ ص ۴۵ پر)

PDF Compressor Free Version

بلراج بخشی

13/3، عیدگاہ روڈ، آدرش کالونی، اُدھم پور 182101 جموں کشمیر (Mob. 09419339303)

قرابت دار

ڈاکٹر نے نیم طبی عملے کی طرف دیکھ کر مایوسی سے سر ہلایا:

''اس سے زیادہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہے ....بس یہی گلوکوز....اور pain killer اس کے ساتھ جو بھی آیا ہے اس سے کہہ دو اسے فوراً کسی سُپر اسپیشلٹی اسپتال میں لے جائے....''

ڈاکٹر چلا گیا اور ایک نرس آپریشن تھیٹر سے باہر آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک پھٹے حال بوڑھی عورت لپک کر اس کے قریب آئی:

''اندر....ایکسیڈنٹ کیس تمہارا ہے؟''

''ہاں....میرا بیٹا کیسا ہے؟''

''تمہارا بیٹا ٹھیک نہیں ہے۔'' نرس نے کہا:

''اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ کر پھیپھڑوں میں چلی گئی ہیں، دماغ میں گہری چوٹ ہے۔ ہم سے جو ہو سکتا ہے کر دیا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اسے کسی اچھے اسپتال میں لے جاؤ.....''

''یہاں ٹھیک نہیں ہوگا؟''

''نہیں، اسے کسی اچھے اسپتال میں لے جاؤ۔''

''کون سے اسپتال میں؟'' بوڑھی عورت روہانسی ہوگئی۔

''پیسے ہیں تمہارے پاس؟''

نرس نے اسے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں.....''

''تو پھر تمہیں کس اسپتال کا پتہ بتاؤں؟ یہیں پڑی رہو۔''

دو وارڈ بوائے آپریشن تھیٹر میں سے ٹرالی کو ڈھکیلتے ہوئے باہر لے آئے اور نرس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''وارڈ نمبر 6 میں لے جاؤ....ڈیوٹی نرس کو سمجھا دینا''

پھر بوڑھی عورت سے بولی:

''.....تم بھی جاؤ اس کے ساتھ.....کسی اچھے اسپتال میں جانا ہو تو بتا دینا۔ کاغذات تیار کروا دیں گے۔'' نرس چلی گئی اور بوڑھی عورت ٹرالی کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں بڑے کانفرنس ہال میں ڈساسٹر مینجمنٹ کی میٹنگ چل رہی تھی۔ ہال کی نیم تاریکی میں بڑی سی دیوار گیر پلازمہ اسکرین پر کسی سیٹیلائٹ نیوز چینل کا میزبان کہہ رہا تھا:

''زمین پر بیرون خلا سے چٹانوں کا گرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ۱۰ فروری 1896ء میں اسپین کے شہر میڈرڈ میں سیارچہ گرا تھا۔ 1949ء میں بھی روس کے چیلیابنسک خطے میں بیس سیارچے گرے جن کا مجموعی وزن ۲۰۰ ٹن تھا۔ 1980ء میں ٹنگسکا میں اسی طرح ایک سیارچہ ٹکرایا تھا جس سے سائبیریا میں 2000 کلومیٹر جنگل تباہ ہو گیا تھا۔ پہلے بھی ایک سیارچہ روس کے اسی شہر سے 25 میل اوپر فضا ہی میں پھٹ گیا تھا۔ اسی طرح ۱۵ فروری 2013ء کو ایک اور سیارچہ زمین کی فضا میں تقریباً 65000 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے داخل ہوا۔ ایک سو کلومیٹر کے فاصلے سے اس کی چمک سورج سے بھی تیز نظر آ رہی تھی اور اس کی تمازت زمین پر محسوس ہو رہی تھی۔ آگ کے جلتے گولے کی طرح زمین کی جانب آتی ہوئی اس چٹان کی رفتار ۳۰ کلومیٹر فی سیکنڈ تھی، لیکن زمین کی حدود میں داخل ہو کر اس کی رفتار 15 کلومیٹر فی سیکنڈ ہو گئی، پھر یہ خلائی چٹان روس کے شہر چیلیابنسک کے ساڑھے اٹھارہ میل یعنی زمین سے تقریباً 30 کلومیٹر اوپر پھٹ گئی جس سے گرم دھول اور گیس کے بادل پھیلتے دکھائی دیے جو زمین کے 26 کلومیٹر نزدیک تک آ گئے اور ایک صدماتی لہر زمین پر محسوس کی گئی۔ چٹان پھٹ جانے سے 500 کلوٹن آتش گیر مادے ٹی این ٹی کی توانائی کا اخراج ہوا جو کہ ہیروشیما پر گرائے

PDF Compressor Free Version

گئے ایٹمی بم "لٹل بیبی" سے تقریباً 25 گنا زیادہ تھی۔ خلا سے آنے والی 62 فٹ چوڑی اس چٹان، کے پھٹ جانے سے جس کا وزن 13000 سے 14000 ٹن کا تھا، خلا سے زمین پر گرنے والے اس کے ملبے سے چھ شہروں میں 7200 عمارتی ڈھانچوں کو نقصان پہنچا اور 100 افراد کو طبی امداد کی ضرورت پڑی۔ یہ آگ کے ایک جلتے ہوئے گولے کی طرح زمین کی جانب آ رہا تھا اور سورج سے بھی تیز چمک دے رہا تھا۔" اینکر نے طویل سانس لیا۔

بیڈ پر لیٹا ہوا مریض گہری گہری سانسوں کے ساتھ اچانک زور زور سے ہچکیاں لینے لگا اور کولہے بار بار جھٹکے سے اوپر اٹھنے لگے جیسے جانکنی میں مبتلا ہو اور بوڑھی عورت گھبرا کر چلانے لگی۔

کچھ دیر بعد نرس نے آتے ہی اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پھر مریض پر ایک اچٹتی سے نظر ڈال کر سائیڈ ٹیبل پر سے کیس فائل اٹھا کر اس میں لگے، محض ایک ورق کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر وارڈ کے وسط میں ایک الماری کی جانب بڑھ کر ایک ہائیوڈرمک سرنج میں ایک امپول سے کوئی سیال بھرا اور واپس مڑی۔ بیڈ کے پاس پہنچ کر اس نے مریض کی کہنی سے اوپر ایک اسٹریپ باندھا، بوڑھی کو ہلتا ہوا بازو زور سے پکڑنے کو کہا اور پھر بہ مشکل تمام انٹراوینس انجکشن دے کر پلاسٹک کی تلف پذیر سرنج ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ سریع الاثر انجکشن سے مریض منٹوں ہی میں معمول پر آ گیا۔

"اب تو یہ ٹھیک ہو جائے گا نا....."

بوڑھی عورت نے بھرائے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک.....؟" نرس نے آنے والی رات میں ایسے کئی مواقع سے اس کے آرام میں پڑنے والے ممکنہ خلل کی پیشگوئی میں کٹکھنے لہجے میں کہا:

"....ٹھیک؟.....ارے یہ مر رہا ہے...."

"ارے...تو کچھ کرو نا....."

اس نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

"بس..... جو ہو سکتا تھا کر دیا.....اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور پوچھنا ہے تو ڈاکٹر سے پوچھو"

اس نے وارڈ کے دروازے کی جانب ہاتھ اٹھایا۔

بوڑھی عورت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر نرس کے جانے کے بعد وہ بھی دروازے کی طرف بڑھی اور راستہ پوچھتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس پہنچ ہی گئی۔

"دیکھو.....تمہیں پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔"

پوری بات سننے کے بعد ڈاکٹر نے کہا اور سمجھایا کہ صرف ڈپٹی کمشنر ہی کچھ حالات میں اس کے بیٹے کا مفت علاج کسی اچھے اسپتال میں کروا سکتا ہے۔ بوڑھی عورت کے اصرار پر ڈاکٹر نے متعلقہ کاغذات تیار کروا کر اس کے حوالے کیے اور اسے ڈپٹی کمشنر کے دفتر کا پتہ سمجھایا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"روسی حکومت کے ترجمانوں نے سرکاری طور پر کہا کہ تیرہ چودہ ہزار ٹن وزنی یہ چٹان روس کے شہر کے اوپر خود بخود پھٹ گئی تھی۔" اینکر کہتا جا رہا تھا، مگر کسی نے بھی اس بات پر یقین نہیں کیا۔ روس پر یہ چٹانیں ایک مدت سے گرتی رہی ہیں، اس لیے گمان یہی ہے کہ ان چٹانوں کو خلا ہی میں تباہ کر دینے کی کوئی تکنیک روس نے بنا لی ہے، لیکن روس اس کا اعتراف کرنے کے بجائے اس پر اکتفا کر جاتا ہے کہ یہ چٹانیں خود بخود تباہ ہو جاتی ہیں اور اب ایک اور خلائی چٹان جو پہلے والی چٹان سے دوگنا زیادہ وزنی ہے اور جس کا وزن تیس ہزار ٹن سے بہت زیادہ بتایا جاتا ہے۔ تقریباً ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کی طرف آ رہی ہے۔ اگر یہ چٹان خلا میں نہیں پھٹ جاتی اور زمین سے آ کر ٹکراتی جاتی ہے۔ تو اس عظیم دھماکے سے ہیروشیما پر گرائے گئے ایٹمی بم سے تقریباً دو سو گنا زیادہ تباہی خیز توانائی کا اخراج ہو گا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ چٹان لاہور اور امرتسر کے درمیان میں کہیں گرنے کا خدشہ ہے بس یہ سمجھ لو کہ یہ چٹان ہندوستان اور پاکستان کے بیچ واگھہ سرحد پر گر سکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے خدا جان بوجھ کر ہندوستان اور پاکستان کو کوئی سبق سکھانا چاہتا ہو۔" بڑی ٹی وی اسکرین پر آسمان سے آگ کا بڑا سا گولہ تیز رفتاری سے نیچے آتا دکھائی دے رہا تھا۔

"صاحب! یہ زبردستی اندر گھس آئی۔" کانفرنس ہال کی مکمل

PDF Compressor Free Version

خاموشی میں گارڈ کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

ڈپٹی کمشنر نے مڑے بنا ہی لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا:

''کہیں بٹھا دو..... بعد میں بات کرتے ہیں۔''

''ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس وزن کی چٹان کا اس رفتار سے زمین کے ساتھ ٹکرانے سے، زمین کے اس خطے پر لامثال تباہی ہوگی۔ پاکستان کا نام ہی صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا اور ہندوستان کا دو تہائی حصہ بالکل ختم ہو جانے کے علاوہ جنوبی ایشیا میں بہت تباہی ہو سکتی ہے۔''

ہال میں خاموشی مزید گہری ہو گئی تھی۔ لوگوں کی سانسیں جیسے رک چکی تھیں۔

''چٹان اتنی دور ہے کہ ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین پہ پہنچنے میں اسے ابھی لگ بھگ دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اس مصیبت سے بچ نکلنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم نے روس کے صدر سے ملنے کے بعد امریکہ کے صدر سے بھی ملاقات کر لی ہے، لیکن دونوں نے اس معاملے میں بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ اب ہندوستانی اور پاکستانی وزرائے اعظم اپنے اعلیٰ حکام کے ساتھ مشورے کر رہے ہیں اور دونوں ملکوں کے عوام بھی اس قیامت سے بچنے کے لیے اپنی اپنی کوششیں کر رہے ہیں۔ جہاں ہندوستان میں جگہ جگہ یگیہ ہون اور ست سنگ کیے جا رہے ہیں، وہیں پاکستان میں گھروں میں، چھتوں پر، بازاروں میں، سڑکوں پر نمازیں ادا کی جا رہی ہیں۔''

ٹی وی اسکرین پر ہندوستان کے کئی شہروں میں ہونے والے یگیہ، ہون ست سنگ اور ہنومان چالیسا کے جاپ دکھائے جا رہے تھے اور دوسری طرف پاکستان میں جگہ جگہ لوگ دوزانو ہو کر آسمان کی طرف دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے رحم کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

''اب کہو.....؟'' ڈپٹی کمشنر نے گارڈ کو شعلہ بار آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بوڑھی عورت پر ایک نظر ڈالی۔

بوڑھی عورت نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ ہلائے، لیکن اس کے ہونٹ محض کانپ کر رہ گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کچھ کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔

ڈپٹی کمشنر نے پاس کھڑے کلرک کو اشارہ کیا جس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کاغذات لے لیے اور ورق گردانی کرنے لگا۔

''یہ سر.....'' تھوڑی دیر بعد کلرک بولا ''اس کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کسی گاڑی کے نیچے آ گیا، اسپتال والوں نے کہا ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے، اسے پرائیویٹ اسپتال لے جاؤ، یہاں اس کا علاج ممکن نہیں۔''

''اسپتال والوں نے کیا کیا؟'' ڈپٹی کمشنر نے پوچھا۔

''گلوکوز کی بوتل لگا دی اور نیند کا انجکشن دے دیا۔''

عورت نے رندھی آواز میں کہا۔

''تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟''

ڈپٹی کمشنر نے عورت سے پوچھا۔

''یہ کہتی ہے کہ پرائیویٹ اسپتال کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' کلرک نے کہا۔

''جس گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا۔ وہ سرکاری ہے یا پرائیویٹ؟'' ڈپٹی کمشنر نے ہمدردی سے پوچھا اور کلرک درخواست کے منسلکات کو پلٹنے لگا۔

''یہ پولیس رپورٹ ہے سر..... ہوں، ں، ں۔ پرائیویٹ گاڑی ہے..... گاڑی نمبر.....''

''اسے باہر لے جاؤ'' ڈپٹی کمشنر نے بات کاٹی..... ''اور پوری بات سمجھاؤ'' کلرک اسے باہر لے گیا۔

حالاں کہ ڈپٹی کمشنر کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ ہنگامی حالات میں کسی مریض کو کسی بھی اسپتال میں سرکاری اخراجات پر بھرتی کروا سکتا ہے، لیکن سڑک حادثے تو روز کا معمول ہیں، اس لیے ہر کس و ناکس کو سرکاری اخراجات پر طبی سہولیات فراہم نہیں کی جا سکتیں۔ گاڑی اگر سرکاری ہوتی یا ایجی ٹیشن میں کوئی زخمی ہوا ہوتا تو بات دوسری تھی۔ اس صورت میں ریاستی یا مرکزی حکومت درماندہ شخص کو سرکاری اخراجات پر ملک کے بہترین اسپتال میں کیا، غیر ممالک کے کسی اسپتال میں بھی بھجوا سکتی ہے۔

''یہ بات سنتی ہی نہیں سر.....''

کلرک نے اندر آتے ہوئے کہا:

PDF Compressor Free Version

''لیکن جس گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا اس کا ڈرائیور نشے میں تھا اور بلا لائسنس کے تھا۔''

''یہ دونوں سرکار کی ذمے داری ہے کہ نہیں؟''

عورت بضد تھی۔

''اس وقت سرکار کے پاس تمہارے بیٹے کے لیے وقت نہیں ہے۔'' ڈپٹی کمشنر نے اسے پھر سمجھاتے ہوئے کہا:

''کچھ پتہ بھی ہے کہ اس وقت یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''وہ دیکھو.....'' ڈپٹی کمشنر نے سامنے دیوار پر لگی بڑی سی ٹیلی ویژن اسکرین کی جانب اشارہ کیا۔ ''جی ہاں دیکھ لیا ہے اور یہی سمجھ میں آیا ہے کہ اس مصیبت سے بچنے کے لیے ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے، سوا دعاؤں اور پرارتھنا کے، لیکن ابھی وقت ہے اور میرے بیٹے کی زندگی کے لیے ابھی کچھ کر سکنے کی گنجائش ہے۔''

''ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ روس اور امریکہ نے ہندوستان پاکستان کو تباہ کر دینے والی ہزاروں ٹن چٹان کو روکنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایسا انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم کی مسلسل درخواستوں پر کیا ہے۔''

اینکر کی آواز آئی اور ڈپٹی کمشنر چونک کر ادھر مڑ گیا۔ کلرک نے عورت کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''ہال میں خوشی کے نعرے گونجنے لگے۔''

''امریکہ زندہ باد.....روس زندہ باد.....''

''ڈی سی صاحب! اب تو آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔''

بوڑھی عورت نے زہریلے لہجے میں کہا:

''.....اب تو میرے بیٹے کے لیے کچھ کیجیے۔'' لیکن ڈی سی کی آنکھیں بدستور ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اینکر کہہ رہا تھا:

''تقریباً تیس ہزار ٹن سے زیادہ وزنی یہ خلائی چٹان، جو تقریباً ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کی طرف آ رہی ہے۔ پچھلے دو مہینوں سے امریکہ اور روس کی خلائی آبزرویٹریوں میں سائنس داں اس کی نقل و حرکت پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہیں، امریکی نیشنل اسپیس ایجنسی یعنی ناسا.....اور کریملن میں روسی اسپیس ایجنسیوں میں گزشتہ دو مہینوں سے اس معاملے پر اطلاعات کا مسلسل تبادلہ ہو رہا ہے، لیکن ہندوستان کو ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی بیرون خلا کی کسی شے کی موجودگی کا محض احساس ہوا اور ابھی دو دن پہلے امریکہ نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اس کی تفصیلات تو فراہم کی ہیں، لیکن ان دونوں کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں، امریکہ اور روس کے خلائی سائنس داں اس پراجیکٹ پر مشترکہ طور پر کام کر رہے ہیں، حالانکہ سبھی اپنے اپنے ملک میں ہیں، لیکن آج کے سائنسی دور میں نہ صرف یہ کہ ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ ایک ہی جگہ ساتھ مل کر کام کر رہے ہوں، بلکہ فورتھ ڈائمنشن ٹکنیک سے امریکہ اور روس کے صدر بھی جیسے وہیں کھڑے کھڑے کام کی براہ راست نگرانی کرتے ہوئے لگ رہے ہیں، حالانکہ سچ یہ ہے کہ وہ سب اپنے اپنے ملک میں ہیں، چلیے اب آپ کو وہیں لے چلتے ہیں جہاں یہ کام ہو رہا ہے۔''

اسکرین کے دو حصے ہو گئے دونوں حصوں میں روس اور امریکہ کی خلائی لیبارٹریوں میں سائنسداں بڑے بڑے کمپیوٹر مانیٹروں کے سامنے بیٹھے آپس میں مشورے کرتے ہوئے ڈائلوں پر اشاراتی سوئیوں کو دیکھ کر کام کر رہے تھے۔

''بات سمجھ میں نہیں آئی سر.....''

ڈی سی کے ساتھ بیٹھے شخص نے کہا:

''وہ انگریزی میں بات کر رہے ہیں اور وہ روسی میں..... پھر دونوں ایک دوسرے کو سمجھ کیسے رہے ہیں؟''

''مشینی ٹرانسلیشن، دونوں اپنی اپنی زبانوں میں بول رہے ہیں، مگر دونوں طرف کے کمپیوٹر اپنی اپنی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں اور ایک تیسرا کمپیوٹر ہمیں دونوں کی باتیں انگریزی میں سمجھا رہا ہے۔''

''لیکن، لیکن گوگل تو صحیح ترجمہ کرتا ہی نہیں..... میں نے کئی بار کوشش کی ہے۔ سب غلط سلط کر دیتا ہے.....''

''اصل میں..... یہ سب باتیں ہماری مذہبی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں.....'' ڈپٹی کمشنر کا لہجہ غصیلا تھا۔

''.....لیکن انگریز انہیں چرا کر لے گئے اور یہ مشینیں بنا لیں۔ اب جو مشینیں وہ ہمیں دیتے ہیں وہ کم سے کم پچاس سال پرانی ٹیکنالوجی ہوتی ہے اور ہم آلو گانے، ریڈی میڈ گارمنٹس بنانے، نوڈلز کھانے اور

PDF Compressor Free Version

کرکٹ کھیلنے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتے ہیں۔"

"سر..... میں نے اسپتال فون کیا تھا۔" کلرک نے ڈپٹی کمشنر کو مخاطب کیا۔

"اس عورت کے بیٹے کی حالت بگڑتی جا رہی ہے، سر....."

"دیکھتے نہیں یہاں ڈساسٹر مینیجمنٹ کمیٹی کی میٹنگ چل رہی ہے....." ڈپٹی کمشنر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"سر..... امریکہ اور روس تو کام کر رہے ہیں نا....." کلرک آہستہ سے بولا۔

"اگر وہ کامیاب نہیں ہوئے تو یہاں بچے گا ہی کیا کہ جس کی مینیجمنٹ کریں گے ہم؟"

"جاؤ..... آرڈر ٹائپ کر کے لاؤ"

ڈپٹی کمشنر نے کہا اور کلرک باہر کی طرف لپکا۔ عورت بھی اس کے پیچھے گئی۔

ڈپٹی کمشنر دیوار گیر ٹیلی ویژن اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ روسی سائنس دان کہہ رہا تھا:

"بیس منٹ رہ گئے ہیں، بیس منٹ میں سیارچہ زمینی فضا میں داخل ہو جائے گا، اس لئے ہمیں جو بھی کرنا ہے اگلے چھ منٹوں کے اندر ہی کرنا ہے، کیونکہ اس کے بعد ہمارے میزائل سیارچے کو چھو بھی نہیں سکیں گے اور سیارچہ زمین پر امپیکٹ کر جائے گا، یعنی زمین سے ٹکرا جائے گا، کیوں مسٹر کیری والز.....؟"

اس نے اپنے امریکی ہم منصب کو مخاطب کیا۔

"یس مسٹر آندرئی ویرانوف، امتحان کا وقت ٹسٹنس؟"

کیری والز نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

"چیکڈ....."

"ڈائریکشن؟"

"لیزر لاکڈ....."

"سسٹم؟"

"اوکے....."

"میزائل؟"

"آرمڈ....."

کیری والز دیوار گیر اسٹیمی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے چلایا:

"جوائنٹ مشن کمانڈ..... صرف تیس سیکنڈ باقی۔ اٹامک کلاک کے ساتھ سنکرونائز کر لو، وقت ملا لو۔ کاؤنٹ ڈاؤن میں تیس سیکنڈ باقی، اے، ے، ے، ن، ڈ..... کاؤنٹ ڈاؤن اسٹارٹ..... ناؤ۔"

کیمرے کا زاویہ بدل گیا۔ اب اسکرین پر سفید ایپرن پہنے ایک امریکی آدمی اور ایک روسی عورت انتہائی تربیت یافتہ اور پرسکون آواز میں ایک ساتھ بولنے لگے:

"نائن....."

"ایٹ....."

"سیون....."

"سکس....."

ٹیلی ویژن اسکرین کے ایک حصے میں ہون یگیہ کر رہے لوگوں کے منتروں کی آوازیں اونچی ہو گئی تھیں اور دوسرے حصے میں سڑکوں، بازاروں، چھتوں پر دعا کے لئے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگ زور زور سے گڑگڑا رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"تھری....."

"ٹو....."

"ون....."

"زیرو....."

اور اس کے ساتھ ہی آندرئی ویرانوف اور کیری والز ایک ہی آواز میں چلائے:

"فائے ے ے ی ئر....."

کاشن کے ختم ہوتے ہی اسکرین پر کئی میزائل اٹھتے ہوئے دکھائی دیے اور ان کے ساتھ ہی کثیف دھوئیں کے مرغولے ساری اسکرین پر چھا گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے میزائل ان میں چھپ گئے، لیکن پھر دھوئیں کو پیچھے چھوڑ کر اوپر اٹھتے گئے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب اسکرین پر ہندوستانی اور پاکستانی وزرائے اعظم دکھائی دیے جو لوگوں کو نظم و ضبط اور امن و بھائی چارہ بنائے رکھنے کی تلقین کر رہے تھے، پھر امریکہ اور روس کے صدر اپنے اپنے ملک میں ناسا اور

PDF Compressor Free Version

کریم لن کے مشن کنٹرول روم میں نظر آئے جن کے چہرے پسینے سے چمک رہے تھے اور وہ پلکیں جھپکائے بنا اپنے اپنے ٹیلی ویژن اسکرین دیکھ رہے تھے۔ میزبان کہنے لگا:

''یہ جو آپ نے اتنے میزائل روانہ ہوتے ہوئے دیکھے ہیں..... یہ واشنگٹن..... یا..... ماسکو سے فائر نہیں کیے گئے بلکہ یہ دنیا بھر میں پھیلے امریکہ اور روس کے خفیہ میزائل اڈوں سے داغے گئے ہیں اور جنہیں زمین کی طرف آرہے خوفناک سیارچے پر الگ الگ زاویوں سے اس طرح داغا گیا ہے کہ وہ اس سے سیدھے نہیں ٹکرائیں گے بلکہ ایک مخصوص طاقت کا ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے ایک ساتھ اس طرح سیارچ کو چھوتے ہوئے گزر جائیں گے کہ سیارچے کی سمت ذرا سی بدل جائے گی اور وہ زمین کے قریب سے گزرتا ہوا ہمیشہ کے لئے خلا میں کہیں گم ہو جائے گا۔''

کلرک اور عورت واپس آئے۔ کلرک نے ہاتھ میں پکڑی فائل آگے بڑھائی۔ ڈپٹی کمشنر نے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر حکم نامے پر دستخط کیے اور اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کلرک اور عورت جھپٹ کر باہر نکل گئے۔

حالانکہ ٹیلی ویژن اسکرین پر ایک چمکتے ہوئے نکتے کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا، لیکن پینٹاگن اور کریملن کے مشن کمانڈ مراکز میں سائنس دان خوفناک سیارچے اور داغے گئے میزائلوں کی رفتار اور سمت ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے تک جانچ رہے تھے اور اسی کی مناسبت سے رفتار اور سمت میں مائیکرو ڈگری کی حد تک ترمیم کرتے جا رہے تھے۔

''اور دوستو.....!'' میزبان کہتا جا رہا تھا۔

''یہ مشن فیصلہ کن دور میں آ گیا ہے۔ یعنی وہ گھڑی آ گئی ہے جب یہ میزائل سیارچے کو جھٹکتے ہوئے گزریں گے اور سیارچہ زمین کو بخش کر نکل جائے گا۔ ہمارے نامہ نگار واشنگٹن اور ماسکو میں موجود ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ کیا بتاتے ہیں۔''

اسکرین تھوڑی دیر کے لئے دھندلا گئی پھر دو خانوں میں بٹ گئی جن میں دو چہرے موجود تھے۔

''جی صرف نوے سیکنڈ باقی ہیں..... زیرو آور آ گیا ہے جب ہندوستان اور پاکستان، دونوں کی تقدیر کا فیصلہ ہو جائے گا..... اگر یہ سیارچہ زمین سے ٹکراتا ہے تو صفحۂ ہستی سے پاکستان کا نام و نشاں ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا اور ہندوستان کا معمولی سا کٹا پھٹا حصہ بچ سکتا ہے جسے سنبھلنے میں کئی صدیاں لگ جائیں گی اور یہ دیکھئے، یہ جو بہت زیادہ چمکتا ہوا نکتہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ وہ سیارچہ ہے جو ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے ٹکرا سکتا ہے اور یہ..... یہ جو کچھ نکتے ہیں، جنہیں ہم دو لاکھ گنا زیادہ کر کے دکھا رہے ہیں، یہ وہ میزائل ہیں جو امریکہ اور روس نے مشترکہ طور پر داغے ہیں۔''

کیمرہ پھر ہون یگیہ اور سڑکوں پر آسمان کی طرف دیکھ کر گڑگڑاتے اور زار زار روتے ہوئے لوگوں کو دعائیں مانگتے دیکھتا اور دکھاتا رہا۔ کئی دھرم گورو اور مولوی لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ یہ سیارچہ لوگوں کے گناہوں کا ہی پھل ہے، جو انہیں سزا دینے کے لئے آرہا ہے۔

''اور یہ..... یہ..... اور یہ آخری بیس سیکنڈ ہیں، اس کے بعد شاید میں اور آپ نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد ہم صبح کے پرندوں کی چہچہاہٹ نہ سن سکیں یا غروب آفتاب کا نظارہ نہ دیکھ سکیں۔'' اس کی آواز بھرا آئی اور وہ خاموش ہو گیا۔

دو حصوں میں بٹی ہوئی اسکرین پر صرف امریکی اور روسی کمانڈ مراکز تھے، جہاں تمام سائنس داں اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر اسکرینوں پر نظریں چپکائے بیٹھے تھے اور وہاں کی مکمل خاموشی بھی چیختی ہوئی لگ رہی تھی۔

''دس سیکنڈ، سات سیکنڈ، تین سیکنڈ اور یہ الوداع.....''

میزبان نے روتے روتے کہا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، لیکن دونوں کمانڈ مراکز میں شور مچ گیا۔ سب لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ ٹی وی میزبان نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے حیرت سے یہ منظر دیکھا اور پھر بڑی دیر بعد سنبھالا لے کر بولا:

''یہ تو کمال ہو گیا..... ہے نا، میں زندہ ہوں.....'' وہ اب زور زور سے رو رہا تھا: ''اور آپ بھی..... او..... ہیلو..... ہم زندہ ہیں، ایں کمال ہو گیا۔''

اسکرین پر دوسرا منظر آ گیا۔ لوگ چلا رہے تھے۔

''بجرنگ بلی کی جے..... ماتا رانی کی جے.....''

PDF Compressor Free Version

''اللہ اکبر.....نعرۂ حیدری.....''

عین اسی وقت ڈپٹی کمشنر کے کانفرنس ہال میں وہ عورت اور کلرک داخل ہوئے۔

''ہم بچ گئے.....''

ڈپٹی کمشنر نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ وہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔

کلرک نے ایک فائل آگے بڑھائی۔

''یار آج تو فائلیں چھوڑو، ہم بچ گئے۔ جشن مناؤ، کیا ہے یہ؟''

''سر.....اس کا بیٹا مر گیا.....لاش لے جانے کے لئے ڈسامسٹر مینیجمنٹ کی کوئی گاڑی چاہیے۔''

''کیوں.....؟ جنازہ گاڑی کہاں ہے؟''

''سر.....اپوزیشن پارٹی کے ورکر چھ دنوں سے گاڑی کو گھیر کر بیٹھے ہیں، کہتے ہیں گاڑی ہلنے نہیں دیں گے۔''

''کیوں.....؟ کیا ہوا.....؟''

''ہیلتھ منسٹر کا کتا لے کر گاڑی جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔''

''کتے کو لے کر.....؟ تو اس پر اتنا ہنگامہ کیوں.....؟''

''چھ دنوں سے اپوزیشن والے پارلیمنٹ نہیں چلنے دے رہے۔ کہتے ہیں گاڑی فارینسک لیبارٹری میں بھیج کر کتے کے فٹ پرنٹ تلاش کرو.....یہ سرکاری املاک کا غلط استعمال ہے.....''

''کون سا کتا تھا.....؟''

''جرمن شیفرڈ ہے سر.....نایاب کتا.....پچھلے سال خریدا تھا۔ پندرہ لاکھ روپے کا۔''

ڈپٹی کمشنر نے سر ہلاتے ہوئے دستخط کیے اور ٹیلی ویژن کی جانب متوجہ ہوا جہاں امریکی اور روسی صدور کانپتے ہاتھوں میں رومال لے کر چہروں سے پسینہ پونچھتے ہوئے آپس میں بات کر رہے تھے۔

''مشن مکمل ہو گیا۔ مبارک ہو.....مسٹر پریذیڈنٹ.....''

امریکی صدر نے کہا:

''آپ کو بھی مسٹر پریذیڈنٹ.....''

''لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی.....''

''کیا؟''

''آپ نے ہندوستان اور پاکستان کو یقینی تباہی سے کیوں بچا لیا؟'' روسی صدر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ خدا میں یقین رکھتے ہیں مسٹر پریذیڈنٹ؟''

''سرکاری طور پر تو نہیں، لیکن نجی طور پر.....کیوں؟''

روسی صدر نے کہا۔

''دراصل مجھے خدا میں یقین ہے۔ ایک دن، یہ دونوں خود ہی ایک دوسرے کو تباہ کر دیں گے، سمجھ رہے ہیں نا؟ میں نہیں چاہتا کہ ان دونوں کی تباہی کا الزام خدا پر آئے.....''

روسی صدر تشویشناک اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

مادری زبان کی اہمیت

زبان ہمیشہ ماں کی طرف منسوب ہوتی ہے اور مادری زبان کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہم پیدائش سے جو زبان سنتے آتے ہیں وہی زبان ہمارے مزاج میں رچ بس جاتی ہے، اسی سے ہمارا خمیر بنتا ہے، اسی میں ہم سوچتے ہیں، بولتے ہیں اور اسی کے طریقوں پر عمل کرتے ہیں۔ مادری زبان سے انسان کی پوری شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اسی لئے تعلیم اور عمرانیات کے ماہرین نے مادری زبان کو بہت اہم سمجھا ہے اور مادری زبان میں تعلیم کی ہمیشہ پرزور سفارش کرتے رہے ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم حاصل کر کے ایک طالب علم صرف اس زبان سے ہی نہیں بلکہ اس کے علمی سرمائے، نسلی روایات، اسلاف کے کارناموں، تہذیبی قدروں اور سماجی تقاضوں سے ذہن پر زور دیے بغیر بھی واقف ہو جاتا ہے۔ وہ اضافی ذہنی ورزش سے بچتا ہے اور اس طرح اپنی ذہنی قوت کو دوسری کام کی باتیں سیکھنے میں لگا دیتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم پانے والا اپنی ذہانت کے ساتھ دور بہت دور تک جاتا ہے اور زمانہ اسے ہمیشہ رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

(ماخوذ)

PDF Compressor Free Version

رابعہ الرباء

Rabia Al-Raba

C/o Rabia Rehman, St 22, House No. 56/1, Cavalry Ground,
Officer Colony, Lahor Cantt., Pakistan
rabiaalraba@gmail.com

دستخط

وہ نشے میں دھت مسلسل رم پیے جا رہا تھا۔ پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ سب رقص و سرور سے مدہوش جا چکے تھے۔ ایک وہ اور ایک لڑکا جو اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ خود تو ریڈ بیئر تک محدود تھا اور بہت کم لے رہا تھا، مگر اپنے باس کا ساتھ زرخرید غلام کی طرح سے دے رہا تھا۔

"بس ایک بار......"

"ایک بار......"

"وہ مجھے مل جائے تو......"

"کسی بھی قیمت پر......"

"ایک بار...... بس ایک بار...... کسی بھی قیمت پر...... تو زندگی میں لوٹ...... لوٹ آؤں گا کسی بھی قیمت پر......"

وہ نشے کی حالت میں بس یہی الفاظ دہرائے جا رہا تھا۔ اس لڑکے کو سمجھ میں آ گیا کہ اس شریف باس کی اس کمزوری سے بہتر اب کوئی اور شے نہیں۔ وہ اسے سنتا رہا، سمجھتا رہا، باس کو تسلی دیتا رہا:

"سر جی...... چھوڑیے، ایسی تو آتی جاتی رہتی ہیں...... چھوڑیے سر...... حکم کریں تو دنیا کی سب سے حسین ہاٹ گرل آپ کے قدموں میں لے آؤں، ایک دفعہ حکم تو کریں۔"

اس کے لہجے میں اتنا اعتبار تھا جیسے وہ مس یونیورس کو بھی اپنے باس کے قدموں کی خاک بنا سکتا ہو۔

"نہیں کے جے، نہیں یار...... بس، وہ...... تجھے پتا نہیں...... وہ کیا چیز ہے...... اپنا دل، پہلی بار دھڑکا ہے کے جے۔ وہ بھی عمر کے اس حصے میں...... جب لوگوں کو دل کے دورے...... دورے پڑتے ہیں۔ اپنا دل دھڑکا ہے...... اس میں سورج جیسی گرمی ہے اور چاندسی ٹھنڈک...... کے جے وہ ناقابل بیان سراپا ہے۔ ناقابل بیان۔ اس میں سے جیسے کوئی لہریں اٹھتی ہیں اور سامنے والوں کو...... اپنی لپیٹ میں لے...... لے لیتی ہیں۔ یہ وصف تمہیں پتا ہے کن کو ودیعت ہوتا ہے......؟ چھوڑو...... کے جے...... دل دھڑکا ہے...... یار......"

وہ سمجھ گیا کہ باس سچ میں اب باس وہ نہیں رہا، کچھ ہوا ضرور ہے۔ کہیں کوئی زلزلہ آیا ہے۔ کوئی بڑا جغرافیائی، سمندروں کو ہلا دینے والا طوفان آیا ہے جو اپنے اثرات بہت گہرے چھوڑ گیا ہے۔ اس کے اندر اک ہلچل سی ہوئی، آخر وہ ہے کون؟ جس کو ہر قیمت پر پانے کے لیے...... باس کی یہ حالت تو میں نے تب بھی نہیں دیکھی تھی جب انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی اور بچے چھوڑے تھے۔ اپنی ماں کے بعد اگر انہیں محبت تھی تو اپنے بچوں سے تھی، مگر بچوں کو محبت اپنی ماں سے تھی، لہذا وہ پیسوں کی مشین بنا رہا۔ اسٹیٹس کا بت، گریڈ ٹوئنٹی ون کا آفیسر، جس پہ معاشرہ رشک کرتا ہے۔

اسے یہ سب سوچتے سوچتے، پیتے پیتے پھر اپنا گریڈ یاد آنے لگا۔ صرف نا ئینٹین پلس۔ اس کی رکاوٹ بھی تو یہی باس تھا۔ یہی اس کا یار، شریف باس، ایک فائل کے سائین ہی کی تو بات ہے۔ اس کا دھیان پھر اس لڑکی کی طرف چلا گیا۔ کون ہو سکتی ہے وہ پری وش؟ میں بھی تو اس شہر کی ہر پارٹی میں جاتا ہوں تو پھر اسے کیوں نہیں جانتا؟ وہ میری نظروں سے کیوں نہیں گزری؟

اس کے باس نے گلاس میز پر رکھنا چاہا تو اچانک وہ گر کر

PDF Compressor Free Version

ٹوٹ گیا۔اس نے خاموشی سے باس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ اسے ان پر رحم آنے لگا۔

''سر چلتے ہیں.....؟''

''چلو.....لے چلو جہاں چاہو۔''اس نے انہیں سہارا دیا اور ہوٹل سے باہر لے گیا۔ڈرائیور کو فون کیا، وہ پارکنگ سے گاڑی پاس لے آیا۔دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے۔وہ باس کو اپنے گیسٹ ہوم میں لے گیا۔اس نے انہیں کمرے تک پہنچایا۔

وہ اسے بھولنے کے لیے ابھی اور پینا چاہ رہا تھا،مگر حالت اب ایک گھونٹ کی اجازت بھی نہیں دے رہی تھی۔کے جے نے ہمت کی اور پوچھ ہی لیا:

''سر.....وہ ہے کون؟''

''ہے یار.....ایک سنجیدہ لڑکی.....گولڈ میڈل دینے گیا تھا اس کو.....سنجیدہ ہے،اپنے آپ میں رہنے والی۔اپنے گھر میں رہنے والی، گھر کی اونچی چاردیواری کے بیچ.....ہے یار.....وہ ہے،مگر نہیں ہے.....''

''سر وہ کرتی کیا ہے؟ کہاں ملے گی؟''

''ارے یار نہیں معلوم، کچھ نہیں معلوم.....نہیں.....میری گاڑی میں ایک رسالہ پڑا ہے۔ایک رسالہ.....وہ دیکھ.....لو.....ظالم اپنے ملک کے لیے لکھتی بھی نہیں۔''

''سر اپنے ملک میں کوئی پڑھتا بھی تو نہیں۔''

وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔اس نے باس کے ڈرائیور کو فون کیا۔وہ کچھ دیر میں گھر پہنچ چکا تھا۔کے جے نے اپنے ملازم کو باس کی گاڑی سے رسالہ لانے کو کہا۔

اتنی دیر میں وہ اپنے وزیٹنگ کارڈ کو غور سے دیکھتا رہا، کامران جواد،مگر باس ہمیشہ کے جے ہی کہتا تھا۔وہ مسکرایا۔باس بستر پر دراز ہو چکا تھا۔

اس نے رسالہ غور سے دیکھا،اسے کوئی لڑکی سمجھ میں نہیں آئی، وہاں تو آدھے آرٹیکل لڑکیوں کے تھے اور سب ہی اسے حسین لگ رہی تھیں کیونکہ اس کا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ عورت بدصورت نہیں ہوتی بس کچھ زیادہ حسین ہوتی ہیں کچھ کم۔یہاں بھی اسے یہی معمہ نظر آیا۔اس نے باس کی طرف دیکھا:

''سر.....کون سا آرٹیکل؟''

''وہ جو مشرقی و مغربی تہذیب پر ہے۔''

اس نے پھر سے رسالہ کھولا تو وہی صفحہ اس کے سامنے تھا۔

''اوہ.....''

اوہ لڑکی تو سچ میں حسین ہے مگر گھریلو نہیں لگتی،باس کو چکمہ دے گئی ہے۔وہ یہ سوچ کر مسکرانے لگا۔جوان ہے،حسین ہے۔ ہاٹ مین چاہتی ہوگی۔اسے اپنی جوانی پہ مان ہونے لگا۔اس نے وہاں سے اس کا ای میل آئی ڈی اپنے موبائیل میں نوٹ کر لیا۔لڑکی کی تصویر میں ایک غرور حسن بھی تھا،جو اسے بھا گیا۔وہ عورت کو تب تک عورت سمجھتا تھا جب تک کہ اس کے غرور کو توڑ نہ دے۔اس کے بعد کوئی عورت اس کے قابل نہیں رہتی۔

''یک نہ شد،دو شد۔''وہ زیر لب مسکرایا۔باس نیم غنودگی کے عالم میں وقفے وقفے سے وہی جملے دہرا رہا تھا۔اس نے ہمدردانہ باس پہ ایک نظر ڈالی۔اُٹھا اور ایک سائیڈ لیمپ جلا دیا اور باقی تمام روشنیاں گل کر دیں اور آہستگی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر کھڑے ملازم کو اس نے آنکھوں کے اشارے سے سمجھایا کہ صاحب کا خیال رکھنا اور رسالہ اٹھائے باہر نکل گیا۔اسے دیکھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔وہ بے نیازی سے،سوچوں میں گم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا:''گھر چلو.....''

بس اس نے انہی دو الفاظ کا سہارا لیا۔سارے رستے اسے لڑکی کے حسن کا غرور دکھائی دیتا رہا،جو اس کا اصل حسن تھا۔حسن بھی کیا شے ہے،غرور کے بنا سجتی ہی نہیں،ٹوٹے بنا بنتی بھی نہیں۔

عجب فلسفے اس کے اندر گردش کرتے رہے۔اسے پتا ہی نہیں چلا،کب گھر آ گیا اور گھر کا دروازہ بھی کھل گیا،گاڑی گیراج میں بھی پہنچ گئی۔''صاحب جی.....''ڈرائیور کی آواز نے اسے چونکایا۔

''ہوں''

''اوہ.....''

''اچھا،یار تم بھی کمال کے انسان ہو،بس اسی لیے مجھے

PDF Compressor Free Version

اچھے لگتے ہو۔''

وہ اس کا دل رکھتے ہوئے گاڑی سے اتر گیا اور اندر گیا۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ نیم تاریکی تھی۔ گویا بیوی سو چکی تھی۔ آج تو اسے کلب بھی جانا تھی۔ تھک گئی ہوگی۔ وہ یہ سوچتے ہوئے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ کپڑے اتارے اور نہانے چلا گیا۔ اب نائٹ سوٹ میں وہ خود کو آزاد پنچھی محسوس کر رہا تھا۔ اپنے قد کے برابر آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنا چاہا، مگر وقت کا سفر کافی ہو چکا تھا۔ اب ان ریشمی گھنے بالوں کی جگہ ریشم کے چند تار رہ گئے تھے۔ وہ مسکرایا، اپنا موبائل اٹھایا اور اسٹڈی روم چلا گیا۔ لیپ ٹاپ آن کیا اس پری وش کو ایک روایتی تعریفی ای میل کیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے لفظوں کا جادو چلے گا کیونکہ وہ اس کی تحریر پڑھ کر سمجھ چکا تھا کہ وہ ملائم اور ریشمی زبان کی رسیا، کسی خیالی پرستان کی دیوی ہے۔

آج وہ بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ مسلسل کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ اس ناکامی نے اسے تھکن سے چور کر دیا تھا۔ بس ایک دستخط کی دیر تھی، مگر بس یہی یار باس اس کو بے ایمان سمجھ رہا تھا۔

وہ کمرے میں لیٹتے ہی سو گیا۔ بوجھ تو وہ شاید پری وش کی ای میل میں اتار آیا تھا۔ محبت کے لفظ، محبت کے جذبے بھی تو کبھی بوجھ بن جاتے ہیں۔ انہیں بھی کبھی کوئی کاندھا چاہیے، کوئی خالی کاندھا۔ صبح دفتر کے کام دھندے، سہ پہر کلب میں میٹنگ تھی، ادھر چلا گیا۔ ابھی وہ کچھ لمحے کسی سے ملنا نہیں چاہ رہا تھا۔

سردی کی سنہری دھوپ میں باہر کسی درخت کے نیچے سجی میز کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اپنا ٹیب نکالا اور ای میل چیک کرنے لگا۔ پری وش کا شکریہ کے پھولوں سے بھرا ای میل آیا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا بات بن گئی۔ وہ مسکرایا اور اس کو جوابی بہار رنگ ای میل کر دیا۔ اس نے اب اپنا موبائل نمبر اور اپنے عہدے کے ساتھ ایک اضافی سرکاری ذمہ داری کا اعزازیہ بھی رقم کر دیا، جس کے مطابق وہ خواتین کے حقوق کا پاسبان بھی مقرر تھا۔

بات میل سے فون تک آ گئی۔ وہ عورت کو عزت دینا جانتا تھا۔ اس کی عزت بھی کرتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ عورت کو محبت کے جال سے پہلے عزت کے جال میں پھانستے ہیں۔ عورت جتنی مظلوم ہوگی اتنا جلد عزت کے سنہری جال میں آ جائے گی۔ وہ عزت ہی کی تو پیاسی ہوتی ہے۔ اس سے اس کا اعتبار بحال ہو جائے تو محبت کا جال اس کے بعد پھینکا جاتا ہے اور پھر جال خود بخود کٹ پھٹ جاتا ہے۔ کے جے نے اسے اپنی باتوں، اپنے لفظوں، اپنے لہجے سے ایسے ایسے شاہی لباس پہنائے کہ وہ خود بخود محبت کی ڈوری میں بندھتی چلی گئی۔

زمینداروں کے مذہبی روایتی رواجوں کی پابند سلجھی، پڑھی لکھی حسینہ جو محافظوں بنا گھر سے نکل بھی نہیں سکتی تھی، اس سے ملنے، ایک بار ملنے کا وعدہ کر بیٹھی اور آخر ٹوٹی کانچ کی راہوں پہ چل کر اس سے ملنے آ گئی۔ اس نے اسے ایک عالی شان ہوٹل میں بڑی شان سے بلایا تھا۔ دھیمی موسیقی اور خوابی روشنیوں میں وہ اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بت تراشنے والوں جیسے تھے۔ چائے پیتے ہوئے وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا جو کہہ رہی تھیں:

''آؤ تمہیں باہوں میں بھر لوں.....'' دوسری طرف دل کہہ رہا تھا: ''کاش ابھی.....'' وہ ان نگاہوں کی گرمی سے تپ تپ ہونے لگی۔ وہ نگاہیں جن میں ہوس نہیں تھی۔ تکریم ذات تھی، مان تھا، تمنا تھی، بلاوا تھا۔ اس سے قبل اس نے یہ سب کسی کی نادان آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ جاتے جاتے دل کے ساتھ جان بھی دے گئی۔ وہ محبت سے اگلی منزل پہ خود قدم رکھ چکی تھی۔

بات ہوتی رہی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ آسمانوں پہ اُڑنا چاہتی ہے، جینا چاہتی ہے، اپنے حصے کی زندگی آپ گزارنا چاہتی ہے۔ کے جے کا خیال بھی یہی تھا کہ یہ پری وش کا حق ہے، اسے ملنا چاہیے۔ کے جے نے اسے زندگی اور زندگی کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس نے بھی کے جے کی آنکھوں سے ٹپکتے جذبوں کا اعتبار کر لیا۔ کے جے نے اسے دور، یہاں سے بہت دور لے جانے کا وعدہ کیا اور یقین دلایا کہ عمر بھر ساتھ دے گا اور کوئی اس تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کے پاس اتنی طاقت وقوت ہے کہ وہ اس کے خاندانی غرور کی تلواریں اس تک نہیں پہنچنے دے گا۔

چند دن بعد وہ کے جے کے کہنے پر اسی ہوٹل آ گئی۔ یہیں سے کے جے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھا کر نجانے کون سے جہان کی اور چل پڑا۔

PDF Compressor Free Version

گھنٹوں کے سفر کے بعد جب گاڑی رکی تو یہ ویرانے میں بنا ایک طویل و عریض بنگلا تھا۔ بڑے رقبوں، اونچی دیواروں کی رہنے والی وہ خود بھی تھی۔ یہ مادیت اسے متاثر نہ کر سکی۔ اس کا مان تو وہ ساتھ تھا، جو اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی، ساتھ نہ تھا۔ اندر اچانک اک گھٹن سا تھا جو لگ گیا تھا۔ کے جے نے تو شرعی ساتھ کا وعدہ کیا تھا۔ شرعی ساتھ کے بنا اینٹوں کی یہ قبر اس کے لیے تنگ ہو رہی تھی۔ اسے اب بھی کے جے کی آنکھوں اور لہجے میں ہوس نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اسے ایک پر تکلف کمرے میں چھوڑ کر خود باہر نکل گیا۔ وہ سہمی ہوئی تھی۔

رات کو جب وہ لوٹا تو اس کی نگاہوں میں وہی مان، وہی عزت، وہی آس، وہی تمنا ٹمٹما رہی تھی۔ وہ ان جگنوں کے سامنے بے بس ہو گئی۔ جوں جوں رات گہری ہوتی گئی، اس کی یہ بے بسی بڑھتی گئی اور آخر کار شب کا ذب پری وش اور کے جے کے درمیان سب پردے اٹھ گئے۔

زندگی وہ جینا چاہتی تھی، مگر جب ہوش میں آئی تو اسے لگا زندگی کے عوض وہ مر چکی تھی۔ کے جے کی آنکھوں اور رویے میں اب بھی ہوس نہیں تھی۔ اس کی نرم و ریشمی باتوں کے ساتھ اس کے لمس میں بھی لطافت کا احساس تھا، ایک مان تھا جس کے سامنے وہ بے بس تھی۔

یہ انسانوں کی کیمسٹری بھی کیا شے ہے۔ کسی کے سامنے سیسے کی دیوار ہے تو کسی کے سامنے پانی کا بہاؤ۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ کے جے صبح چلا جاتا اور رات کو آتا۔ یونہی ایک ماہ گزر گیا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے اندر جیسے اک اور جسم نے جگہ بنا لی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کے جے کو بتایا۔ وہ یہ سنتے ہی خوشی کے مارے اس سے لپٹ گیا، لیکن اس کی قبر کی دیواریں اس کے اپنے ہی گرد اور تنگ ہو رہی تھیں۔ اب تو پسلیوں کی ہڈیاں بھی آپس میں کڑکرانے لگی تھیں۔

''یہ روح کس کے نام سے منسوب ہوگی۔''

یہ سوال اس کو اندر ہی اندر گھول رہا تھا۔ بظاہر وہ زیادہ حسین ہوتی جا رہی تھی، مگر اندر، اس عالی شان عمارت کے اندر گھن کا کیڑا گھس گیا تھا۔

کے جے بہت خوش تھا۔ پری وش کو اس بات پہ بھی حیرت تھی کہ کے جے کی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ کالے شیشوں کی گاڑی میں لیڈی ڈاکٹر بھی آنے لگی۔ اس کا چیک اپ کرتی، مسکراتی، مبارک دیتی، چلی جاتی۔

وہ اُڑنا چاہتی تھی۔ وہ اُڑ تو رہی تھی۔ پرواز کہاں کو تھی، یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کے جے اسے سوال کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا:

وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ: ''میں خوش ہوں ناں، تو تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے۔ میں تمہیں چھوڑ کر تو نہیں جا رہا ناں۔ عمر بھر ساتھ کا وعدہ کیا ہے تو نبھاؤں گا۔''

ابھی تک اس نے ایک وعدے کے سوا سب وعدے نبھائے بھی تھے۔ زبان کا پکا نکلا، اس لیے پری وش بے بس ہو کر خاموش ہو جاتی۔ یوں بھی اب وہ بے بس ہو چکی تھی۔ سب کشتیاں جل چکی تھیں۔ موت آگے تھی، تو پیچھے بھی موت ہی تھی۔

نو ماہ یونہی آنکھ مچولی میں ہی گزر گئے۔ ڈاکٹر گھر پہ ہی رہنے لگی اور ایک رات کے جے کی صورت کا ایک بچہ اسی پر لطف کمرے میں لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھوں میں رو رہا تھا۔

آج اس کو کے جے کی ضرورت تھی، مگر آج کے جے کہاں تھا؟ آج وہ کے جے کے ساتھ اپنی خوشی بانٹنا چاہتی تھی، لیکن آج کو وہ آیا ہی نہیں۔ پری وش رات بھر اس کی منتظر رہی، مگر وہ نہیں آیا، ایک دن، ..... دو دن..... تین دن..... ڈاکٹر بھی پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی، نہ فون تھا۔ نہ سیل تھا، نہ انٹرنیٹ، وہ کس جگہ تھی اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا، اتنے عرصہ میں کے جے اتنے دن اس سے دور رہا بھی نہیں تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

کے جے آج پھر اسی ہوٹل میں اپنے باس کے ساتھ تھا اور باس آج بھی یہی کہہ رہا تھا:

''ایک بار..... بس ایک بار کسی بھی قیمت پر..... زندگی اس کے قدموں میں..... قدموں میں نچھاور کر دوں گا۔ اس نے پہلی بار ..... یار پہلی بار..... کسی نے میری روح کو، روح کو چھوا ہے۔''

''سر اور اگر آپ اس کی زندگی کے پہلے مرد نہ ہوئے تو؟''

کے جے نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تو ہمیں..... اپنے والی..... کون سی..... کون سی..... پہلی جگہ ملی تھی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ عورت جس سے منسوب..... منسوب ہوتی

PDF Compressor Free Version

ہے، اس کی نہ بھی ہو تو..... اسی کی کہلاتی..... کہلاتی ہے۔"

"سر میں کوشش کر رہا ہوں۔ اسے آپ کے قدموں کی دھول بنا دوں۔ کر رہا ہوں کوشش۔"

گلاس آج بھی گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ آج بھی کے جے انہیں اپنے گھر لے گیا تھا۔ آج بھی وہ نیم تاریک کمرے میں غنودگی کے عالم میں تھے۔ آج بھی کے جے ڈرائیور کے ساتھ گھر چلا گیا تھا۔

صبح یار باس کے دفتر کے باہر کے جے کی گاڑی رکی۔ اس نے اپنے ڈرائیور کے ہاتھ ایک فائل باس تک پہنچائی۔ یار باس نے فائل کھولی۔ اس میں ایک کاغذ پہ مختصر تحریر رقم تھی:

"میں نے اس لڑکی کو ایک گروہ سے بازیاب کرالیا ہے۔ وہ میری تحویل میں ہے۔ سرکاری طور پر یہ بات ابھی خبر نہیں بنی۔ میں اس مجبور لڑکی کو سمجھا کر آپ تک پہنچا سکتا ہوں۔ وہ سچ میں محبت کے قابل ہے اور اگر آپ مظلوم کو پناہ دے بھی دیتے ہیں تو الزام آپ پہ نہیں آئے گا، بلکہ کریڈٹ ہوگا کیونکہ وہ کئی ماہ سے گھر سے غائب تھی، مگر ایک فائل آپ کی میز پر بھی دستخط کی منتظر ہے۔" یار باس نے پڑھا تو بے چین ہو گیا:

"ساری عمر نہیں کیا میں نے یہ سب۔ اب آخری سال میں، جاب کے آخری سال میں۔"

اس نے اپنے ویسٹ انڈین ڈرنک میں پناہ تلاش کی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کیا کرے۔ ساری رات تاروں میں بیت گئی۔ اگلی صبح وہ دفتر جلدی چلا گیا۔

اس نے فائل پر دستخط کر دیئے۔ فائل کو آج پیر لگ گئے تھے۔ رات کو کے جے کا ڈرائیور یار باس کو اس بڑی سی قبر میں لے گیا۔ جہاں اک محبت مسکرا رہی تھی۔ یار باس گاڑی سے اترنے لگا تو ڈرائیور نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھا دیا: "بڑے صاحب، یہ صاب جی نے مجھے دیا تھا کہ آپ کو دے دوں۔"

یار باس نے لفافہ پکڑ لیا اور باہر نکلا۔ ٹھنڈی ہوا محو رقص تھی۔ یار باس نے لفافہ کھولا۔ کاغذ پہ دو جملے مسکرا رہے تھے۔

"سر عورت کو ہمیشہ آنکھوں کے پانیوں میں سنبھالتے ہیں۔ اسے سنبھال کے رکھئے گا، بہت قیمتی ہے۔" ❁❁

نرم لہجے کا فسوں (ص ۳۳ سے آگے)

آئیں جن سے میں کل ملا تھا، جن کے نرم لہجے میں چھپے اس طوفان نے مجھے ایک مشورہ دیا تھا۔ سناٹا کب بہت مہیب اور بھیانک ہو جائے، کوئی نہیں جانتا۔ مجھے ان کے شوہر یاد آ گئے اور میں کانپ گیا..... واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس ملک میں نہ جانے کتنی جگہوں میں ایسا بھیانک سناٹا ہے۔ ہر صوبے کا سناٹا الگ الگ نوعیت کا ہے، مگر بہت سارے گاؤں کا سناٹا ایک ہی جیسا ہے اور ایسے سناٹے کو توڑنا اتنا آسان نہیں، میں جا رہا ہوں، میری ماں اور میرے پتا کی آنکھیں میری راہ تک رہی ہیں۔"

وہ کھیا کے مکان سے نکل کر برگد کے پیڑ کی بغل سے نکلا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پتہ نہیں اسے کیا خیال آیا۔ دل پر ہاتھ رکھتا کھیا کے مکان کی طرف تیز تیز قدموں سے واپس آنے لگا۔ اس نے مسکرا کر موٹر بائیک والے شخص کو دیکھا اور کھیا جی کے دروازے پر دستک دی۔ رام دیال نے دروازہ کھولا۔ "کیا ہوا بابو.....؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "میرا قلم کمرے میں چھوٹ گیا ہے۔" اس نے کہا۔ رام دیال نے بہت ہی پھرتی دکھائی اور اسے قلم لا کر دے دیا۔ "تھینک یو رام دیال جی۔ یہ میری بائیں جیب میں دل کے قریب رہتا ہے۔ اب قلم دل کے ساتھ مل کر کیا محبت کی فصل اُگا سکے گا، دیکھتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے رام دیال کو دیکھا، بائیک والے کو دیکھا اور سنسان بستی سے تیر کی طرح نکلتا چلا گیا۔ ❁❁

ضروری اطلاع

زبان وادب کی خریداری کے لئے آپ زرسالانہ سو روپے براہ راست اردو اکادمی کے اکاؤنٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں، لیکن رقم بھیجنے کی جانکاری کے ساتھ ہی اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر اکادمی کو ضرور بھیج دیں۔

Bihar Urdu Academy

Bank of India, Chauhatta, Patna 800004

SB A/c No. 440810100006014

IFSC Code- BKID0004408

PDF Compressor Free Version

کہکشاں انجم

3091C/23, Huda Gurgaon 122017 (Haryana)

وقت کا سحر

وقت کیا کیا رنگ بدلتا ہے اور وقت کے ساتھ چلتے چلتے ہم بھی ہر رنگ کو اپنانے میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ عادتیں، مزاج کیسے ہر رنگ میں رنگ جاتا ہے، ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا۔

کبھی سردیوں کی شام میں سرِ شام ہی لحافوں میں دبک کر بیٹھنے کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ دو بڑے بڑے تختوں کے درمیان انگیٹھیاں سلگ رہی ہوتیں، ہم بچے لحافوں میں دبکے مونگ پھلی اور چلغوزے چھیل چھیل کر کھاتے ہوئے ایک دوسرے پر چھلکے اچھالتے، چھیڑ چھاڑ کر رہے ہوتے۔ کبھی لڑائیاں بھی ہوتیں تو بڑے آ کر صلح صفائی کراتے۔ ہم بھی سب بھول کر پھر ایک ہو جاتے۔

ذرا دور آنگن میں چھپر تلے مٹی کے چولھے پر بڑا سا برتن رکھے شبراتن بوا بڑوں کے لئے چائے بنا رہی ہوتیں، ادرک، گڑ کی سوندھی سی خوشبو پورے گھر میں پھیل رہی ہے، ساتھ ہی ہمیں آلو، شکر قندی بھون بھون کر پیش کر رہی ہیں۔

آنگن پار کر کے دوسرے بڑے دالان میں گھر کے بڑے براجمان ہیں، گھر خاندان کے چھوٹے بڑے مسائل سلجھاتے ہوئے خوش گپیوں میں معروف۔

وہ وقت گزرا..... زمانہ آگے بڑھا، اب گرم اونی کپڑوں میں لپٹے سرد ٹھنڈی ہواؤں سے لڑتے، گھر کے سامنے کی سنسان سڑکوں پر گھومنا سب سے اچھا لگنے لگا، بزرگوں کی ڈانٹیں، پیار کی بوچھار لگتی، ہم اپنے جہاں میں گم، خوشیوں میں شرابور ہر ڈانٹ کو دلار سمجھ کر ہنستے مسکراتے رہتے۔

وقت کا ساحر آگے بڑھا اور پھر ایک دن ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ کاندھوں پر یوں آ گرا کہ گھر..... گھر اور گھر کی ذمہ داریوں کے سوا اپنی خوشیاں اپنی چاہت سب خواب ہو گئیں اور جب سب ذمہ داریوں سے ذرا سی فرصت ملی تو..... اپنا کمرہ اپنا گھر سب سے پرسکون گوشہ لگنے لگا ہے۔ میں تھوڑی افسردہ، تھوڑی خوش اور ذرا سی ڈری، سہمی سی سفر کی تیاریوں میں لگی ہوں۔

خوشی کی وجہ تو سمجھ میں آ رہی ہے، اپنے جگر گوشوں سے ملنا، مگر یہ گھبراہٹ اور ڈر.....؟ شاید سفر..... سفر کی پریشانیاں ڈرا رہی ہیں، کبھی سفر میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کہیں بھی آنے جانے کے لئے ہمیشہ کمر بستہ رہتی تھی۔ اب عمر کے اس آخری پڑاؤ پر آ کر سفر کی پریشانی جھیلنے کی ہمت ٹوٹ رہی ہے۔ اپنا گھر..... اپنا پرسکون کمرہ سب سے اچھا لگنے لگا ہے۔

سوچتی تھی اپنے سب فرائض پورے کر کے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق مل گیا ہے، لیکن یہ تو صرف میرا گمان نکلا، میری زندگی..... میرے وقت پر اب بھی میرا اختیار کہاں ہے۔؟ اب میرا شوق نہیں، بچوں کی محبت کھینچ رہی ہے۔

''امی..... امی.....! کہاں گم ہو رہی ہیں، جلدی کریں.....''

ٹھنڈ میں سوچیں بھی جمی جا رہی ہیں، انجانی سی سوچیں، انجانے سے ڈر اور فکریں.....؟ میں حیران پریشان سی شال اٹھا کر سیڑھیاں اترنے لگی ہوں۔ اپنی کیفیت میں خود سمجھ نہیں پا رہی ہوں، سردی اور ٹھنڈ کوئی نئی تو نہیں برسوں جھیلا ہے اور ہوائی سفر.....؟ وہ بھی بارہا کیا ہے، پھر یہ فکروں کے ناگ کیوں لپٹ رہے ہیں۔؟

ایرو پلین کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا، کاشف نے خدا حافظ کہا اور میں برف سی جمتی چلی گئی۔

(بقیہ ص ۶۵ پر)

PDF Compressor Free Version

طنز و مزاح

شاہ فیاض عالم ولی اللّٰہی
Rahmanpur, Barsui, Dist. Katihar

غالبؔ کی سیاسی شاعری

عنوان پڑھ کر بہت سے لوگ چیں بجبیں ہوں گے۔ ممکن ہے کچھ لوگ صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں کہ آخر یہ کیا عنوان ہے، غالبؔ کا دور تو ادب، برائے ادب کا تھا۔ ادب برائے زندگی تو اس دور جدید کی پیداوار ہے۔ ویسے بھی چچا غالبؔ نے ادب برائے زندگی سے بےزاری کا اعلان ان لفظوں میں فرمادیا تھا۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

ظاہر ہے غم روزگار سے بے زاری کا اعلان ادب برائے زندگی سے بےزاری کا اعلان ہے۔ ادب برائے زندگی کا تعلق سیاست، پروپگنڈا، ہنگامہ آرائی اور انقلاب سے ہے، اس لئے یہ دعویٰ کہ غالبؔ صاحب سیاسی شاعری بھی فرماتے تھے بڑا ہی جرأت مندانہ بلکہ زبردستی کا دعویٰ ہے، آپ کے اندیشے بجا اور آپ کے خیالات درست، لیکن مجھے پھر بھی اپنے عنوان پر اصرار ہے اور اس سلسلہ میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

آپ جانتے ہیں یہ زمانہ پوسٹ مارٹم کا ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں لوگ پیدا ہوتے تھے اور مرجھی جاتے تھے، لیکن ان کو جیتے جی اور نہ بعد از مرگ پوسٹ مارٹم سے سابقہ پڑتا تھا، خواہ موت کسی حادثہ کی وجہ سے واقع ہوتی ہو یا نگہ ناز سے شہادت نصیب ہوجائے، لیکن آج کسی حادثہ میں موت واقع ہوجائے تو ہلاکت کی وجہ ظاہر ہوتے ہوئے بھی پوسٹ مارٹم ضرور کیا جائے گا اور موت کے اسباب کا پتہ لگایا جائے گا جو پہلے سے سب کو معلوم ہے۔ خواہ اس قسم کی اموات کی روک تھام کی بجائے ان کی بہتات ہی کیوں نہ ہوجائے اور صاحب یہ پوسٹ مارٹم حادثات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ادب میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔ یعنی شاعر کا ذہنی پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے کلام کے دیوان کا بھی پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے کہ شاعر نے کن کیفیات وعوامل سے متاثر ہوکر یہ شعر کہا ہے یا شاعر کے شعور یا لاشعور میں کس قسم کے روایتی یا بغاوتی میلانات تھے جس کا اظہار اس نے اپنے اس اشعار میں کیا ہے یا شاعر کس حد تک جنسی دباؤ یا فساد گندم سے متاثر تھا؟ یا شاعر کے کلام میں کس حد تک معاشی، سماجی یا سیاسی میلانات کا پتہ چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے پوسٹ مارٹمی دور کے تقاضے سے متاثر ہوکر میں نے بھی چچا غالبؔ کے دیوان کا پوسٹ مارٹم کرنے اور اس میں سیاسی جراثیم تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالبؔ ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں رہتے تھے، لال قلعہ سے بلی ماران کی گلی دور نہیں وہ ایک حساس اور نازک مزاج شاعر تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس زمانے کے سیاسی حالات سے متاثر نہ ہوتے اور ان کی طرف اپنے کلام میں اشارہ بھی نہ کرتے؟ یہ ضرور ہے کہ وہ سیاست بازوں سے ڈرتے تھے۔ آدمی شریف اور مرنجاں مرنج قسم کے تھے اور ہر شریف آدمی کو سیاست بازوں سے ڈرنا ہی چاہئے، چاہے وہ لیڈر نہ سہی لیڈر کا دربان ہی کیوں نہ ہو، دیکھئے فرماتے ہیں۔

دل ہی تو تھا سیاست دربان سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

لیجئے یہاں غالبؔ نے کھلے طور پر سیاست کا ذکر کیا ہے، اس کا صحیح انداز انہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جو آج کل کسی وزیر سے ملنے کے لئے بغیر کسی وسیلہ کے جائیں خواہ وزیر صاحب وزیر بننے سے پہلے کوچہ و بازار میں جوتیاں چٹخاتے ہوئے کیوں نہ پھرتے ہوں، لیکن وزیر بننے کے بعد ان سے ملنے جایئے تو آپ کو سب سے پہلے دربان سے واسطہ پڑے گا اور پھر اس کی سیاست خدا کی پناہ، کام پانچ منٹ کا کیوں نہ ہو وہ آپ کو

PDF Compressor Free Version

گھٹنوں بٹھائے رکھے گا اور اگر آپ نے اس کی سیاست کو نہیں سمجھا اور اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا تو انتظار کی صبر آزما گھڑیاں کاٹنے کے بعد آپ سے بڑی سادگی سے کہہ دے گا:

''آج ملاقات نہیں ہوسکتی، صاحب بہت بزی ہیں'' اور ناچار آپ اپنا سامنہ لے کر واپس آجائیں گے اور دوسرے دن سے پھر وہی چکر چلے گا اس وقت تک جب تک کہ آپ ''سیاست درباں'' سے عہدہ برآ ہونے کے لائق نہ ہوجائیں۔ اب دیکھئے غالبؔ کا ایک معرکتہ الآرا سیاسی شعر یہ ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

شہزادے کی شادی کے موقع پر غالبؔ نے سہرا لکھا اور استادشہ، شاہی شاعر ذوقؔ پر مقطع میں چوٹ ہوگئی، اگر آپ موجودہ شارحین غالبؔ کے طرف دار ہیں تو یہ کہیں گے کہ اب یہ تو اتفاقی طور پر غالبؔ نے کہہ دیا تھا، لیکن آج پوسٹ مارٹم کا دور ہے، آپ اگر واقعات سے یہ ثابت بھی کردیں کہ یہ محض ''سخن گسترانہ بات'' تھی، تو میں کہوں گا کہ غالبؔ کے لاشعور میں یہ بات تھی کہ وہ ذوق سے بڑے شاعر ہیں، لیکن ان کی ناقدری ہورہی ہے، بارگاہ سلطانی میں ان سے کم درجہ کے شاعر کی ان سے زیادہ عزت افزائی ہوتی ہے۔ گویا اس شعر میں بادشاہ کی جوہر ناشناسی اور ناانصافی کی شکایت اور اس کے خلاف احتجاج ہے، لیکن بادشاہ بھی بڑا باریک بیں تھا، وہ لاشعور کے تہہ خانے تک پہنچ گیا اور جبین سیاست شکن آلود ہوگئی، تو سیاست شاہ سے ڈر کے غالبؔ سے ازراہ سیاست ایک معذرتی نظم لکھ ڈالی جس کے یہ اشعار اہم ہیں۔

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

غرض حکومت اور رعایا کے درمیان کوئی کھینچ تان ہو اور پھر یہ دور ہوجائے، ظاہر ہے سیاست اسی کو کہتے ہیں۔

اس نئے دور میں علی سردار جعفری اسیر ہوئے تو اپنے خیالات ''پتھروں کی دیواریں'' میں ظاہر کئے۔ ان کی یہ شاعری سیاسی شاعری کے خانے میں آتی ہے، اس نئے دور میں فیض احمد فیضؔ کو قید میں ایک مدت گزارنی پڑی انہوں نے اپنی بپتا ''زنداں نامہ'' میں ظاہر کی، ان کی شاعری کو سیاسی شاعری قرار دیا جاتا ہے۔ غالبؔ بھی گردش سیاست میں آکر گرفتار زنداں ہوئے تو انہوں نے بھی اپنی بیتی اپنے کلام میں بیان کی، مگر یہ کیا بے انصافی ہے کہ غالبؔ کے یہ اشعار سیاسی قرار نہیں دیے جاتے۔

جس دن سے ہم غریب گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں، بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسیری میں سوز دل کا حال بیان فرماتے ہیں۔

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

مگر اسیری میں بھی انہوں نے عزم واستقلال سے کام لیا، فرماتے ہیں۔

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

آدمی جہاں ایک عرصہ تک رہتا ہے اس کو اس جگہ سے ایک طرح کی ذہنی وابستگی ہوجاتی ہے خواہ وہ جیل ہی کیوں نہ ہو۔ یقین نہ آئے تو کسی سزایافتہ لیڈر سے مل کر دیکھ لیجئے وہ اپنی جیل یاترا کی کہانی کس قدر مزے لے لے کے سناتے ہیں۔ غالبؔ جب جیل سے چھوٹے اور جیل کا لباس ان کے جسم سے جدا ہوا تو حسرت سے کہا۔

ہائے اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

❁❁❁

☆ گناہوں پر نادم ہونا، ان کو مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر مغرور ہونا انہیں برباد کردیتا ہے

☆ جب تک آدمی زبان نہیں کھولتا، اس کے عیب وہنر چھپے رہتے ہیں

PDF Compressor Free Version

منظومات

ابوالخیر نشتر

Jangi Masjid, Bettiah 845438(Mob. 9931452289)

تضاد

یہ کل کی بات ہے
اک انجمن میں
نقاب شاعری رخ پر لگائے
فقیہ شہر نے فتویٰ دیا ہے
''سیاست شاعری سے دور رکھو''
کہا میں نے ادب سے
جناب آئے ہیں کسی جنگل سے اُڑ کر
یہ بزم شاعری ہے
یہاں جلوہ فگن ہیں
آسمان فکر وفن کے چاند تارے
وہاں منحوس منظر
یہاں دلکش نظارے
یہ کل کی بات ہے
عجب یہ ماجرا ہے
صداقت دم بخود حیرت زدہ ہے
نظر میں دور تک اک سانحہ ہے
یہ اہل فکر وفن کی انجمن ہے
نگاہ غیرت ناہید شرمندہ ہے
لیکن، میں اک شاعر بے چارہ
شکستہ حال، بے بس، غم کا مارا
فقط علم وعمل ہے
اور مطالعے کا سہارا
ادب کی انجمن میں
نوائے فکر ہے نشتر کی یارو
سیاست سے جدا ہے
آج کی گندہ سیاست
سیاست کی حقیقت ہے، سیاست
سیاست کیا ہے، تم کیا جانتے ہو؟
حقائق کی شمع ہے
سیاست علم ودانش جاودانی
سیاست راز الفت جاں فشانی
سیاست آفتاب زندگانی
سیاست کی صفت صدیوں پرانی
سیاست کا تعلق دین سے ہے
جہالت عقل کی دشمن ہے، ناداں
اگر تم شاعر ہو تو، سن لو
اگر علامہ خود سر ہو، سن لو
یہ ارشاد گرامی حضرت اقبال کا ہے
''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''

PDF Compressor Free Version

شاہد اختر

Gaya College, Gaya, Bihar (Mob. 09939970616)

رنگ طلسمات

ڈوبتی شام کی
ایک تصویر آنکھوں میں ہے
دھندلی دھندلی سی
بنتی بگڑتی ہوئی
رقص کرتی ہوئی، مسکراتی ہوئی
زندگی سے ملاقات کرتی ہوئی
آگہی کی سلگتی ہوئی دوپہر میں عزائم مرے
طاق نسیاں میں روشن رہے
اپنے انجام سے بے خبر

آئنہ خانہ دل میں تھی
بے صدا منظروں کی گھٹن
اپنے ماضی کی بے رنگ یادوں کا
اڑتا غبار
جن سے تھا
روش کا طلسمی سفر شرمسار
جانے کب تک رہیں گے یہ لیل و نہار
اپنے انجام سے بے خبر
تازہ دم
پھر فرشتہ صفت لوگ بھی ہیں یہاں
جن کے دم سے کبھی
دل میں احساس تیرہ شبی
رنگ باغ تماشا میں تبدیل ہوتا رہا
یہ الگ بات ہے
آنکھ جلتی رہی
جسم تپتا رہا
جس کو ہونا نہیں چاہیے تھا یہاں
روز ہوتا رہا
شام کی ایک تصویر آنکھوں میں تھی

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

اسرار جامعی

Editor "Post Martam" Jamia Nagar, Delhi 110020

نقادِ اعظم

اک بڑا نقاد ہوں میں جامعی اس دور کا
اب بڑا مجھ سے نہ ہوگا اور نہ تھا کوئی بڑا

میں ہی میں ہوں ہر جگہ ، میرے سوا کوئی نہیں
میں خدائے فکر و فن ہوں ، دوسرا کوئی نہیں

میں ہمیشہ میں رہوں گا ، ہم میں ہوسکتا نہیں
دھاک سب پر جم گئی ہے ، اس کو کھو سکتا نہیں

ہوں خطیب بے بدل ، شاد بھی ، قتال بھی
کوئی مانے یا نہ مانے ماہر اقبال بھی

ماہر اقبال بھی ہوں اک نرالی شان کا
اپنا فن اقبال نے بھی مجھ سے سیکھا ہے سدا

میرا پڑھنا اور لکھنا سب زمانہ ساز ہے
سر میں یہ سودا نہیں ہے ، فکر کی پرواز ہے

تبصرے کا حق ہمیشہ میں ادا کرتا رہا
بس کتابیں سونگھ کر ہی تبصرہ کرتا رہا

ان کتابوں پر بھی جم کر کر دیا ہے تبصرہ
جن کے پڑھنے سے نہ ہو کچھ بھی کسی کو فائدہ

اس کہانی پر نئی تنقید لکھ دوں گا ابھی
جو نہیں لکھی گئی ہے یا نہ ہو اب تک چھپی

ذہن شاعر میں جو پکتی جارہی ہے شاعری
التجا کوئی کرے تو دس ورق لکھ دوں ابھی

اک صدی کے بعد اک ناول جو لکھا جائے گا
سو ورق کا تبصرہ کل رات اس پر لکھ دیا

میں نے لکھی ہیں کتابیں بھی ادب کی بے شمار
جن سے پچھلی سب کتابیں ہو گئیں ہیں داغ دار

''حافظ شیراز'' کو ''سودائے دلی'' لکھ دیا
''شیخ سعدی'' کو ادب کا ''شیخ چلی'' لکھ دیا

''شب خونی'' سے افسر کو لکھا ہے ''پوسٹ مین''
اور ''وہابی اشرفی'' سے معتبر کو ''گھوسٹ مین''

کیا ہوا بدلہ نہیں ہے اب بھی میرا ڈھنگ تو
میں نے ''بلا'' اور ''رنگا'' لکھ دیا بے رنگ کو

اس لئے کثرت سے لکھتا اور چھپتا ہوں سدا
تاکہ دنیا جان لے کہ میں نے ہے لکھا پڑھا

میں نے افسانے کو ناول لکھ دیا تو کیا ہوا
ماننا سب کو پڑے گا چونکہ میں نے لکھ دیا

جب قلم میرا چلا جو دل میں آیا لکھ دیا
زعم میں تنقید کے ظلمت کو سایہ لکھ دیا

رات کو میں دن لکھوں یا دن کو لکھ دوں رات ہے
کون ہے جو چوں کرے گا کس کی یہ اوقات ہے

میری نقادی کا سب پر رعب ہے چھایا ہوا
اس لئے کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ساحر داؤدنگری

6/275, Lalita Park, Laxmi Nagar, Delhi 110092 (Mob. 9868706845)

زندگی اور سیاست کے نام کچھ نظمیں

(۱)

اکثر و بیشتر ہوتا یوں ہے
زخم سہلاتا ہوں، مرجاتا ہوں
زخم اتنے ہیں، ہزاروں ہیں کہ گننا مشکل
نہ کوئی غیر نہ اپنوں سے شکایت کوئی
میری تقدیر جہاں چاہے گی، لے جائے گی
جس طرح گزری ہے، باقی بھی گزر جائے گی
اکثر و بیشتر ہوتا یوں ہے

(۲)

آگے پیچھے چاروں طرف سانپ ہی سانپ
میں سیاسی اعلانات کے چنگل میں ہوں
سانپوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے
سرسراتے ہوئے سانپ
زندگی ان کے درمیان مفلوج ہے
زندہ رہنے کے لئے
سیاست سے اور سانپوں سے
ایک ساتھ گزرنا مشکل ہے

(۳)

عمر کے کچے کچے کھیلوں کو چھوڑ کر
اب میں وہاں کھڑا ہوں
جہاں ایک ٹھونٹھ پیڑ ہے
سبز، یرقانی پتوں سے آزاد
میں موازنہ کرنے کی حالت میں بھی نہیں ہوں
دیکھ رہا ہوں
بوڑھے کمزور درخت کو گرتے ہوئے
ایک دن سایہ اٹھ جاتا ہے
جڑیں کمزور ہو جاتی ہیں
اور درخت آندھی میں اکھڑ جاتا ہے
بے نام آندھیوں کی زد میں
گمشدہ زندگی کے اوراق پر دستخط کرنا
ایک مشکل کام ہے

(۴)

ریت ہی ریت
اُڑتی ہوئی دھول
آسمان کے نیلگوں رنگ کی جگہ صرف دھبے
آندھیوں میں کوئی بھی منظر صاف نہیں
میں کیوں زندہ ہوں؟
سیاست کے بے رنگ مناظر کے درمیان
شفق کی سرخی بھی غائب
اب موت پر تماشے نہیں ہوتے
خون نہیں بہتا
ماتم اور آہ و فغاں کی رسمیں بھی سو چکی ہیں
سیاست کے ناپاک صفحے پر
صرف ایک تاناشاہ کی موجودگی ہے
قہقہے لگاتا ہوا
لاشوں کے ڈھیر پر کھڑا
وہ اب اپنے لوگوں کی گنتی کر رہا ہے
اب آہستہ آہستہ ان کی بھی باری آنے والی ہے
تاناشاہوں کی سیاست میں
اکیلا ہوتا ہے تاناشاہ
دھول اُڑتی ہے
آسمان کا رنگ بدلتا ہے
خون کے دھبے غائب ہوتے ہیں
اور سیاست کے ناجائز جسم سے
ہر بار
پیدا ہو جاتا ہے
ایک نیا تاناشاہ

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شفیع احمد فاطمی

Yasin Colony, Bagh Pato, Patna City, Patna 800008 (Mob. 9308885569)

غزل

برہنوں کے دل سے اٹھتا ہے دھواں آہستہ بول
بول ، لیکن اے چپیہے پی کہاں آہستہ بول

مت بنا تو گھر کو مچھلی کی دکاں آہستہ بول
سیکھ لے گھر کا نہ طوطا یہ زباں آہستہ بول

نرم گفتاری بھی ہے حسن بیاں آہستہ بول
کہہ نہ بیٹھیں لوگ تجھ کو بد زباں آہستہ بول

غم کی باہوں میں بڑی مشکل سے سوئے ہیں اسیر
اے مرے پیروں کی زنجیر گراں آہستہ بول

میرے بھائی گھر کا بٹوارہ مجھے منظور ہے
اس گھڑی ہے موت کے بستر پہ ماں آہستہ بول

یہ فضا منہ سے نکلتے ہی اُچک لیتی ہے بات
تو ہے زیر گنبد بزم جہاں آہستہ بول

لوگ کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی ہوتے ہیں کان
خواہ اپنا ہو کہ غیروں کا مکاں آہستہ بول

موسم ماتم ہے ، گلشن سے گئی فصل نشاط
بلبل شیریں دہن ، جادو بیاں آہستہ بول

دشمنوں کو مفت مل جائے گا موضوع مذاق
مصلحت یہ ہے خلافِ دوستاں آہستہ بول

خود ہی ہوجائے نہ تو ثقل سماعت کا مریض
سیکھ آدابِ تکلم ، مہرباں آہستہ بول

خود کلامی سے مٹا ٹوٹے ہوئے دل کی بھڑاس
بڑھ بھی سکتا ہے عتابِ رازداں آہستہ بول

گفتگو کے وقت مذہب کا بھی رکھ کچھ احترام
پاس کی مسجد سے ہوتی ہے اذاں آہستہ بول

فاطمی یہ عہد پیری ہے گیا دورِ شباب
اب تو آہستہ ہی چل اے ناتواں آہستہ بول

PDF Compressor Free Version

پروفیسر راشد طرازؔ

''عبید منزل'' دلاور پور، مونگیر (Mob.9934628955)

غزلیں

جہاں پہ سجدۂ ایماں کا نور ہوتا ہے
وہاں بھی حلقۂ امکاں کا نور ہوتا ہے

جہاں پہ ملتے ہیں محنت کشاں پسینے میں
وہاں پہ جذبۂ انساں کا نور ہوتا ہے

ستارے فرطِ مسرت سے مسکراتے ہیں
جہاں کہیں دلِ ویراں کا نور ہوتا ہے

جو درد لیتا ہے ویرانیوں کی غربت کا
اسی میں قلبِ بیاباں کا نور ہوتا ہے

جسے خیال ہے تاریکیٔ شباں کا ہنوز
وہ ماہتابِ شبستاں کا نور ہوتا ہے

دعائیں دیتی ہے ہر رہ گزر مسافر کو
وہ جس سے مشعلِ تاباں کا نور ہوتا ہے

طرازؔ پہنچا ہے اس منزلِ مشقت پر
جہاں وجود کے عرفاں کا نور ہوتا ہے

❁❁❁

دامن کسی پیکر کا جہاں چاک نہیں ہے
اس کے لئے نم دیدۂ افلاک نہیں ہے

اب کس کی مسیحائی یہاں کام کرے گی
جب زخم مری روح کا بے باک نہیں ہے

کیوں درد مرا اہلِ وطن کو نہیں منظور
مٹی بھی لہو سے مرے کیا پاک نہیں ہے

نکلے گا اسی مٹی سے انوار تغیر
کیا شعلہ بنانے کو مری خاک نہیں ہے

کیا امن و محبت کا مسلماں نہیں حامی
کیا ایسی کہیں امت لولاک نہیں ہے

کیا صبحِ ازل میں ترا شامل نہیں انوار
یا شامِ شفق میں ترا ادراک نہیں ہے

کوئی تو طرازؔ اپنی قناعت پہ ہے نازاں
کیا فخر یہی حاصلِ املاک نہیں ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

حیرتؔ فرخ آبادی

"Khosla House" North Office Para, Dorindha
Ranchi 834002 (Mob. 9431917878)

غزلیں

دل کی حالت کبھی نہ کھولیں گے
کچھ بھی ہوجائے کچھ نہ بولیں گے

آج ہیں چپ تو کچھ وجہ ہوگی
آئے گا وقت ہم بھی بولیں گے

کچھ سبب ہے اسی لئے چپ ہیں
ہیں کچھ اسرار جن کو کھولیں گے

ابھی کچھ اور کام کرنے ہیں
جب بھی فرصت ملی تو رولیں گے

خون کے آنسوؤں کی ہے بہتات
ہم گناہوں کو اپنے دھولیں گے

زخم ہونے نہ دیں گے بے ترتیب
ہم قرینے سے سب پرولیں گے

جاگنا ہے نصیب میں اپنے
نیند جب آئے گی تو سو لیں گے

ہم تو حیرتؔ ہیں ضبط کے عادی
نہ چلا بس تو آنکھ دھولیں گے

❁❁❁

یہ خلاؤں کے نہیں شعر اس سنسار کے ہیں
ناقدو جانچو ، بتاؤ یہ کن افکار کے ہیں

شعر سچا ہے وہی جس میں حقیقت ہو بیاں
باقی نقادوں کے جھگڑے ہیں ، سب بیکار کے ہیں

وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے اندازِ سخن
شاعر آزاد ہے ، لہجے کئی اظہار کے ہیں

کہیں رک جاتے ، ذرا بیٹھتے دو پل کے لئے
پاؤں بخشے بھی تو للہ کیا رفتار کے ہیں

روح نیلام ہوئی جسم کی بولی بھی لگی
ہم کو رہنے دو یہیں ہم اسی بازار کے ہیں

ذہن اور جسم کا ہر زخم گوارا تھا مگر
گھاؤ جو دل پہ لگے ہیں تری گفتار کے ہیں

کون ہے کتنا گنہگار نا یہ پوچھو فضول
ان کو پڑھ لو جو یہ ٹکڑے کئی اخبار کے ہیں

کاش مل جاتی یا دے دیتا کوئی ان کو سمجھ
وہ جو منگل کے ہیں ، جمعہ کے ہیں ، اتوار کے ہیں

بستیاں اجڑیں نا ، لاشوں پہ بھی ، روئے نہ کوئی
اتنا تو سوچیں کہ ہم سب اسی گھر بار کے ہیں

ہم کو حیرتؔ نہ ہوس زر کی ہے نا مال کی ہے
ہم کسی چیز کے بھوکے نہیں بس پیار کے ہیں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شمیم قاسمی

Sector-D, Shershah Street, New Azimabad Colony, Patna 800006

غزلیں

جان کے ہجر میں رو لیتا ہوں ، گا لیتا ہوں
تم کہتے ہو اچھا شعر بنا لیتا ہوں

تھوڑے سے غم ، ڈھیر سا میں نشہ لیتا ہوں
بتیانی جو بات نہیں بتیا لیتا ہوں

آئینہ میں جب حسن سنورنے آتا ہے
میں بھی چپکے سے داڑھی بنوا لیتا ہوں

سمت بدل کر آتا ہوں آسودہ کرنے
دریا ہوں ، سوچو ندی سے کیا لیتا ہوں؟

جسمانی ورزش سے بھی بجھ جاتی ہے پیاس
آنکھ سے بھی میں اکثر کام چلا لیتا ہوں

بات اَنا کی ہو تو میں یاروں کو بخشوں
ضد پہ اَڑے رہتے ہیں سو پنگا لیتا ہوں

میری روح کا جنگل یوں مہکا تو نہیں ہے
صندل جسم کا رات گئے تخنہ لیتا ہوں

تسمۂ پا میں کھول رہا ہوں ، کھلنے دے
موت! ذرا سا وقفہ دے ، میں آ لیتا ہوں

❁❁❁

چھوڑنے والا کہاں دشت کا پیچھا کرگس
سوکھے منظر ہیں ، مگر ہے ترو تازہ کرگس

شب کے سناٹے سے اک فاختہ ٹکرائی تھی
اور مرے جسم کے اندر سے اڑا تھا کرگس

سچ تو یہ ہے کہ شکاری کا نشانہ چوکا
قصر شاہی پہ نظر آیا تھا بیٹھا کرگس

گردش وقت ٹھہر! پاؤں میں گھنگھرو باندھوں
تونے تو رنگ بدل ڈالے نہ بدلا کرگس

جھانک کر اپنے گریبان میں دیکھا کس نے
آئینہ خانے میں کب جھانکنے والا کرگس

اگلیو! تم ہی اسے برف بنا سکتی ہو
ایسے ٹھنڈا کہاں ہوتا ہے بدن کا کرگس

پھر سے اک بار ذرا پیٹ سے پتھر باندھیں
سب کے حصے کی غذا کھائے گا تنہا کرگس

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

محمد شاہد پیٹھان

582, O.T.C. Scheme, Udaipur 313001 (Raj.)

غزلیں

سامنے دریا بہتا ہے
پھر بھی پیاسا خیمہ ہے
کم نظروں کو کیا معلوم؟
کیا مٹی ، کیا سونا ہے
ہر اک فتنے کا الزام
کیوں ہم پر ہی آتا ہے
دل کا نالہ صبح گہی
عرش بریں پر پہنچا ہے
شیش محل کے لوگوں کو
ہر لمحہ اندیشہ ہے
الجھے ہیں سب لوگ یہاں
دنیا گورکھ دھندا ہے
حرص و ہوس کی دنیا میں
کون اب کس کا ہوتا ہے
آپ اداس ہیں کیوں ''صاحب''
دل تو میرا ٹوٹا ہے
ایک طرف ہوں میں شاہد
ایک طرف یہ دنیا ہے

❁❁❁

ہے یہی شکوہ ہمیں احباب سے
بے خبر ہیں عشق کے آداب سے
موجِ خوں گزری ہے سر سے بارہا
ہم لڑے ہیں وقت کے گرداب سے
وہ بھی دردِ ہجر سے ہیں مضطرب
ہم بھی ہیں کچھ ماہیٔ بے آب سے
سامنے میرے نہ تھا کوئی حریف
پشت پر خنجر لگا احباب سے
جب ملیں ، الٹی ہی تعبیریں ملیں
خوف اب آنے لگا ہے خواب سے
صبح غم ، شام الم ، موجِ ستم
منسلک ہیں زندگی کے باب سے
عقل نے رکھا ہمیشہ ''فکر مند''
دل کے ہاتھوں ہم رہے ''بیتاب'' سے
جن کی فطرت میں تھی شاہد حق روی
ہوگئے وہ رہنما نایاب سے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

تنویر اختر

Moh. Mughalpura, Sahsaram (Mob. 7488399326)

غزلیں

شاخوں سے پھول راہ سے پتھر سمیٹ لو
مل جائے جو نصیب سے ہنس کر سمیٹ لو

خواہش کی پیاس بجھتی نہیں عمر بھر کبھی
تم لاکھ اپنی سمت سمندر سمیٹ لو

خوش رنگ اک حصار ہے ، دھوکہ ہے زندگی
دنیا کی خواہشات کا چکر سمیٹ لو

بے منظری کی خاک ہے آنکھوں کے سامنے
جیسے بھی ہو عروج کی چادر سمیٹ لو

روشن رہیں گے فکر کے اوراق عمر بھر
اپنے ہنر کو لفظوں کے اندر سمیٹ لو

آندھی کا زور تیز ہے ، بارش تھمی نہیں
پرواز کر نہ پاؤ گے شہپر سمیٹ لو

کام آئے گا اندھیروں سے گزرو گے جب کبھی
آنکھوں میں عکس ماہِ منور سمیٹ لو

آنکھوں کے آئینے میں جو محفوظ ہوسکے
فصل بہار میں وہی منظر سمیٹ لو

موقع نکل نہ جائے کہیں دسترس سے دور
کچھ کاسہ حیات میں اختر سمیٹ لو

❁❁❁

میں فقیر مست کیا دیکھوں گا دنیا کی طرف
دل کھنچا جاتا ہے میرا اب تو عقبیٰ کی طرف

دیکھنا اک روز میں روشن جبیں ہو جاؤں گا
جسم و جاں کا ہر عمل ہے راہِ مولا کی طرف

ڈوبنے والے کا ممکن ہے کہ مل جائے سراغ
آؤ چل کر دیکھتے ہیں سیل دریا کی طرف

دسترس حاصل مجھے ہو جائے گی فرہنگ میں
ذہن کی آنکھیں کھلے تو لفظ و معنی کی طرف

شام کی دہلیز سے لوٹے ہیں جو بھی نامراد
اب نئی کوشش میں سب ہیں صبح تازہ کی طرف

دھوپ کی شدت ، گلوں کی چاشنی پینے کے بعد
دل مرا راغب نہیں اب جام و مینا کی طرف

میں تہی دستی میں اپنی قید اک مدت سے ہوں
بھیج اب مولا مجھے رزق کشادہ کی طرف

دوستوں کی بھیڑ سے اختر مجھے لینا بھی کیا
میں اکیلا چل پڑوں گا دشت و صحرا کی طرف

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

کتابوں کی دنیا

نام کتاب	:	غبارِ فکر
مصنف	:	سالم شجاع انصاری
مرتب	:	مجیب شہزر
ناشر	:	مشکوٰۃ پبلشرس، علی گڑھ
صفحات	:	۱۴۴ قیمت : ۳۰۰ روپے
مبصر	:	حسن نواب حسن

جناب سالم شجاع انصاری کا شعری مجموعہ ''غبارِ فکر''، جاذبِ نظر بھی ہے اور جاذبِ خرد بھی۔ کتاب کے نام میں لفظ فکر کی رعایت سے خرد کا لفظ ہی مربوط لگتا ہے۔ اسلوب بیان اور مختلف الفاظ کی ترکیب استعمال فکر وخرد کو نہ صرف متوجہ کرتے ہیں بلکہ کہیں کہیں مہمیز بھی کرتے ہیں، مگر کوئی بھی چیز ہر اعتبار سے مکمل (Perfect) نہیں ہوتی۔ کئی جگہوں پر شاعر جس فکر وفلسفہ کو پیش کرنے کے لئے جن الفاظ کا استعمال کرتا ہے وہ اس کی فکر کے دامن سے چھوٹتے اور پھسلتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ معنویت کے ساتھ ساتھ شعریت یہ دونوں چیزیں مل کر ہی شعر کو صحیح معنوں میں مکمل کرتی ہیں۔

اس مجموعہ کے مقدمہ نگار جناب رئیس الدین رئیسؔ نے شاعر موصوف کی تعریف میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جناب شجاع انصاری ''گل وبلبل''، ''لب وعارض'' اور ''رندوزاہد'' عہد پارینہ کے گھسے پٹے الفاظ سے گریز کرتے ہیں، اس لئے وہ عہد حاضر کے جدید اور نمائندہ شاعر ہیں۔ مسئلہ جدید یا قدیم طرز کے الفاظ کا نہیں بلکہ الفاظ کی ترکیب استعمال اور اسلوب کا ہے۔ عہد پارینہ کے الفاظ بھی اگر علامتی طور پر استعارہ کی طرح استعمال کئے جائیں تو وہ اشعار کی معنویت اور جاذبیت دونوں میں جان پیدا کردیتے ہیں۔ ''ساحل''، ''گرداب''، ''طوفان''، ''منجدھار''، ''بادبان'' یہ سب بھی تو عہد پارینہ کے الفاظ ہیں تو شاعر موصوف نے اسی مجموعہ کے صفحہ ۸۷ پر ایسے الفاظ کیوں استعمال کئے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ کون سا لفظ کس وقت شاعر کے فکر وخیال کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اس کا قطعی فیصلہ پہلے سے نہیں ہوسکتا اور اس کے لئے جدید وقدیم کی تقسیم تو بالکل ہی بے معنی ہے۔ مثلاً درج ذیل شعر دیکھئے۔

بادلوں میں اور ہواؤں میں یہی سازش ہوئی
جل چکا جب میرا گھر تب زور کی بارش ہوئی

یہاں پر تو بادل ہوا، بارش بھی قدیم الفاظ ہیں، مگر جدیدیت سے بھرپور ہیں، چونکہ ان الفاظ کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، لہٰذا معنویت اور جاذبیت دونوں ہی پائی جاتی ہے۔ نبیرہ شادؔ عظیم آبادی، جناب بہزادؔ فاطمی رسالہ ''سہیل'' کے ''حسن نواب'' نمبر میں اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''جس فکر یا خیال کا اظہار کیا جارہا ہے اس کے لئے
برجستہ برمحل اور مناسب الفاظ کا استعمال ہوا ہے کہ نہیں
یعنی افکار والفاظ دونوں کا ہم آہنگ ہونا لازمی ہے۔''

شاعر موصوف کے مجموعہ میں عصری حسیت کے اشعار بھرے پڑے ہیں، مگر کیا سبھی اشعار میں جدید طرز کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ان کا حسب ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں۔

بدلتے وقت کا شاید یہی تقاضہ ہے
پرائے اپنے ہوئے اپنے سب پرائے ہوئے

دور جدید کا شعر ہوتے ہوئے بھی غور کریں کہ اس میں کون سے جدید طرز کے الفاظ استعمال ہوا ہے۔ بنیادی نکتہ کی بات صرف یہی ہے کہ الفاظ اور افکار دونوں ہم آہنگ ہیں کہ نہیں اب اسی معنویت کا دوسرا شعر نا چیز کا برجستہ اور برمحل حوالہ کے طور پر پیش خدمت ہے کہ شاعر موصوف کے مذکورہ خیال کی بھرپور تائید ہوجائے ملاحظہ ہو۔

اپنا کوئی غیر بن جائے تو اس کا غم نہیں
ہے یہ بہتر غیر کوئی بن کے جب اپنا رہے

PDF Compressor Free Version

اب شاعر موصوف کا ایک جدید طرز کا شعر ملاحظہ فرمائیں ۔

یونہی نہیں ہیں یہ سرگوشیاں ہواؤں میں
فصیل شہر پہ شاید چراغ جل اٹھے

بڑے حسین انداز میں زمانے کی ہواؤں کے بدلتے ہوئے رخ کی بات کہی گئی ہے اور پھر ہوا کے سامنے چراغوں کا جل اٹھنا بے شک انقلاب زمانہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، پھر شاعر موصوف کا یہ شعر بھی دیکھیں جس میں قدرے ندرت کے ساتھ بات کہی گئی ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا کہ شاعر کو مشکل ردیف کے برمحل استعمال پر مناسب قدرت حاصل ہے ۔

آنکھوں کے حاشیہ پہ عجب گرد جم گئی
صحرا نورد ہو ہی گئے نوحہ خوان زخم

صحرانوردی کے حوالہ سے آبلہ پائی، اشک آبلہ پائی تک کی بات اشعار میں اکثر ملے گی، مگر مذکورہ شعر میں آنکھوں کے حاشیہ پر گرد جم جانے اور اس کے زخم پر نوحہ خوانی ایک نئی ترکیب ضرور ہے "زخم" کی مشکل ردیف میں شاعر کے سبھی اشعار کامیاب تو نہیں، مگر اور بھی کچھ اشعار

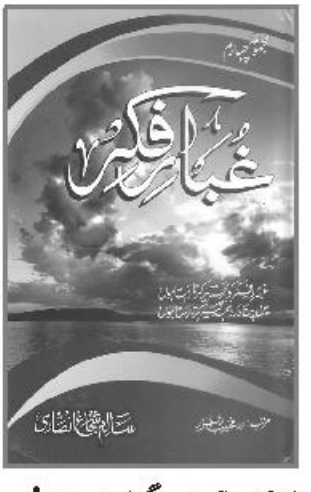

بہت خوب ہیں، جو دوسری غزلوں کی مشکل ردیف میں پائے جاتے ہیں مثلاً "سیاہ بدن"، "آہ بدن" اور دوسری غزل میں، "تراش خراش"، "فاش، خراش"، "بودو باد خراش" وغیرہ جیسی مشکل ردیف میں بھی طبع آزمائی کر کے شاعر نے قادرالکلامی کا ثبوت تو دیا ہے، مگر فصاحت اور شعریت کا دامن ہاتھ سے کہیں کہیں چھوٹتا بھی نظر آتا ہے۔ اگر فکر و فلسفہ کے ساتھ زبان کی فصاحت بھی برقرار رہے تو شعر سے بھرپور لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً شاعر موصوف کی دوسری غزل کا مقطع ملاحظہ ہو ۔

خود میں جو ڈوبے تو سالم آج تک ابھرے نہیں
اک سمندر سے زیادہ ذات کی گہرائی تھی

اور دوسرا شعر بھی ملاحظہ ہو ۔

تمام عمر تصور نہ بن سکا تصویر
مٹا رہا ہوں نقوش اپنے ہی بنائے ہوئے

مشکل قافیہ و ردیف کو فکر کی گہرائی اور فلسفہ تصوف کے ساتھ اپنے بدن کو خانقاہ سے تعبیر کرنا بھی ایک فنی مہارت سے کم نہیں ۔

درون ذات میں جلوہ نمائیاں کس کی
یہ کس کے دم سے ہے آباد خانقاہ بدن

ظاہر ہے کہ درون ذات اور جلوہ نمائیاں جیسے الفاظ کے بعد 'بدن' کی ردیف کے لئے خانقاہ ہی کا لفظ چسپاں کرنا تھا، مگر میں پھر عرض کروں گا افکار کی معنویت پیش کرنے کے لئے مانوس اور ادق الفاظ سے وہ بات نہیں بنتی چونکہ سیدھے سادے عام فہم الفاظ زیادہ دل پزیر ہوا کرتے ہیں، علامہ شبلی نے میر انیس کے متعلق لکھا ہے کہ "الفاظ ان کے سامنے فوج کے سپاہیوں کی طرح صف باندھے کھڑے رہتے ہیں اور جیسے ہی وہ اشارہ کرتے ہیں ان کے اشعار میں آ کر فٹ ہو جاتے ہیں" خود شاعر موصوف کا یہ شعر دیکھئے ۔

تلاطم سے نکل آتی ہیں بچ کر کشتیاں ساری
مگر خطرہ ہمیشہ دوستو ساحل سے ہوتا ہے

یہ دعوت فکر دیتا ہوا شعر عام فہم بھی ہے اور پر اثر بھی حالانکہ "ساری" کے بدلے "اکثر" بہتر ہوتا، پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ "تلاطم" کشتیاں، ساحل وغیرہ قدیمی الفاظ ہیں تو کیا پر معنی اور پر اثر نہیں؟ اور کیا یہ دور جدید کے پر فریب مزاج اور برتاؤ کی طرف اشارہ نہیں کرتے، مذکورہ شعر کے اسی خیال کی تائید کرتے ہوئے ایک برمحل شعر مجھ سے بھی سن لیجئے ۔

منجدھار کا مجھ کو خوف نہیں طوفان کا مجھ کو غم کیسا
غم ہے تو بڑا غم اس کا ہے کشتی کو کناروں نے لوٹا

غرض کہ شاعر موصوف کے کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ندرت اور معنویت کے ساتھ ان کا مزید یہ شعر دیکھیں ۔

لگاتے ہیں صلیب و دار ہم پر قہقہے اکثر
گزر جب بھی ہمارا کوچہ قاتل سے ہوتا ہے

شاعر موصوف رباعی کے میدان میں بھی پہنچ رکھتے ہیں اور کئی رباعیاں

PDF Compressor Free Version

ان کی مختلف شخصیتوں کے حضور میں بطور نذرانہ پیش کی گئی ہیں جو بہت خوب ہیں۔ نظموں میں بھی ان کی دسترس اچھی ہے۔ خاص کر ان کی وہ نظمیں خود احتسابی اور خود کلامی کے انداز میں قابل ستائش ہیں، جو ''آئینہ احساس'' اور ''احساس زندگی'' کے عنوان سے کہی گئی ہیں۔ پوری نظم سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ میں ہے، مگر فکر و معنویت سے بھر پور ہے۔ آخر سہل ممتنع کی شاعری کو زیادہ اہمیت کیوں دی جاتی ہے، اسی لئے کہ براہ راست قاری کے دل میں اتر جانے والی بات اس میں موجود ہوتی ہے۔ عام فہم الفاظ میں بھی معنویت کی گہرائی ہوتی ہے۔ مثال کے لئے صرف ایک شعر دیکھئے ۔

صحت تھی جس کی اچھی وہ سوئے تھے گہری نیند
جو مبتلائے درد تھا وہ جاگتا رہا

بظاہر یہ ایک عام بات ہے، مگر اس کے پردے میں ''سونے جاگنے'' اور ''درد'' کا تعلق احساس اور بیداری سے ہے، جو معنویت سے بھر پور ہے۔ مختصر یہ کہ جناب سالم شجاع انصاری کا یہ شعری تحفہ ''غبار فکر'' مجموعی اعتبار سے قاری پر ایک اچھا اثر چھوڑ جاتا ہے اور یقیناً شاعر موصوف دور جدید کے نمائندہ شاعروں میں کہے جانے کے لائق ہیں۔ کتاب کا گٹ اپ بھی خوبصورت ہے اور طباعت بھی اور قیمت بھی موجودہ گرانی کے دور میں زیادہ نہیں، معقول ہے۔

نام کتاب	:	خانوادہ سیدہ بنت فاطمہ زہراؓ
مؤلف	:	مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری
ناشر	:	دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
صفحات	:	۲۲۴ قیمت : ۲۰۰ روپے
مبصر	:	مولانا محمد عالم قاسمی

زیر تبصرہ کتاب ''خانوادہ سیدہ زینب بنت فاطمہ زہراؓ'' بہار کی مشہور و معروف خانقاہ، ''خانقاہ مجیبیہ'' پھلواری شریف کی ایک بزرگ صفت، صاحب علم و قلم، عظیم المرتبت شخصیت جناب سید شاہ ہلال احمد قادری کی تاریخی و تحقیقی کاوش کا ثمرہ ہے، جس میں سیدہ زینب بنت فاطمہ زہراؓ کے خانوادہ کا سلسلہ بڑی تفصیل سے محققانہ انداز میں ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح یہ شجرہ طیبہ پھلواری شریف بہار تک پہنچا۔ چونکہ اس خانقاہ کے بزرگوں کا سلسلہ نسب انہیں سے ملتا ہے۔ حضور پاک کی چار صاحبزادی میں سے صرف فاطمہ زہرا سے سلسلہ نسل چلا اور حضرت فاطمہ کی اولاد میں حسنی و حسینی سلسلہ تو عام ہے اور بیٹیوں میں ام کلثوم جو حضرت عمر کے نکاح میں تھیں، ان سے صرف ایک لڑکے زید ہوئے، مگر یہ نسل بھی منقطع ہوگئی اور چھوٹی بیٹی حضرت زینب بنت فاطمہ سے ہی سلسلہ چلا جو زینبی کہلاتا ہے۔ اس کی تفصیل اور نسب کی کیا اہمیت ہے اس کے لئے مذکورہ کتاب کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں۔

تمہیدی طور پہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہار کی خانقاہوں میں قدامت میں چاہے جو بھی آگے ہوں، مگر شہرت و مقبولیت میں جو مقام خانقاہ مجیبیہ کو حاصل ہے وہ کسی دوسری خانقاہ کو نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ یہاں رشد و ہدایت کے ساتھ علمی اور تحقیقی سفر بھی ہمیشہ رواں دواں رہا اور یہ بھی کہ خانقاہ ہمیشہ غیر متنازع اور متفق علیہ بنی رہی۔ ہر طبقہ کے لوگ اس سے وابستہ رہے۔ امارت شرعیہ کے تین امیر اسی خانقاہ کے ہوئے۔ "جمیعۃ العلماء" جیسی مذہبی سیاسی جماعت کے بہار صدر حضرت سید شاہ عون احمد قادری اس منصب پر تاحیات رہے اور آج بھی اس خانوادے کے افراد کا تعلق امارت شرعیہ اور "جمیعۃ العلماء" سے بدستور قائم ہے۔ یہ بات سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس خانوادے کے افراد نے اپنی تحریر اور تقریر سے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی اور جادۂ اعتدال کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مسلکی تعصب کے معاملہ میں یہ خانقاہ مینار ہدایت کا کام دیتی ہے۔ اس خانوادے کے ہر فرد میں علم و عمل کی بلندی کے باوجود حلم و بردباری، تواضع اور سادگی، نیز شرافت و نجابت کا کمال واضح طور پہ محسوس ہوتا ہے۔ انہیں پاکیزہ اطوار کے حامل اس کتاب کے مؤلف بھی ہیں جو مایہ ناز صاحب قلم ہیں اور کئی تحقیقی کتابیں ان کے قلم گہربار سے منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے تو یہ پیش نظر رہے کہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے افراد کا خاندانی شجرہ حضرت فاطمہ زہرا کی

PDF Compressor Free Version

چھوٹی بیٹی حضرت زینب کی پاکیزہ شاخ سے ملتا ہے جو نواسی رسول کریم

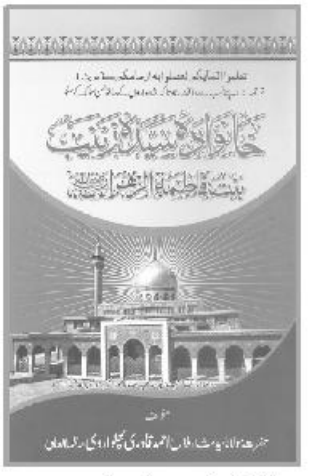

ہیں۔ اسی نسبت کے باعث اس شاخ کی نسبت رکھنے والے زینبی جعفری کہلاتے ہیں، مگر مشہور بزرگ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، صاحب "مدارج النبوت" اور بعض اکابر نے یہ لکھ دیا کہ حضرت زینب بنت فاطمہ زہرا کی نسل منقطع ہوگئی، یہ ایک تاریخی تسامح ہے، جس کے رد میں بہت ہی عالمانہ محققانہ انداز میں پچیس سے زائد مستند کتابوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نواسی رسول کریم حضرت زینب بنت فاطمہ زہرا کا نکاح حضرت عبداللہ ابن جعفر طیار سے ہوا، جن سے تین بیٹے ہوئے۔ دو بیٹے عون اور محمد اپنے ماموں حضرت امام حسین کے ساتھ کربلا میں شہید ہوگئے اور علی بن عبداللہ بن جعفر طیار سے نسل چلی، جن کی ایک شاخ چھٹی یا ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان آئی۔ ہندوستان آنے والے بزرگ کا نام شیخ نوارالدین یار پراں ہے، پھر ان کی اولاد میں سے ایک بزرگ امیر عطاء اللہ پھلواری شریف میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہ شیر شاہ سوری کا عہد تھا اور اب چار سو سال سے زیادہ گزر چکے کہ یہ خاندان یہاں آباد ہے۔ اس خاندان کے بڑے بڑے اولیائے کاملین اور حاملین علم وفن نے اس مدت میں اپنی تابانی ہر سو پھیلائی۔ یہ خانوادہ رشد وہدایت اور علم وفن کا آج بھی مرکز بنا ہوا ہے۔ اس خانوادے کے نسب کی ضروری کڑیوں کو ملانے کی اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک پیچیدہ کام تھا جس کو بڑی جانفشانی سے مدلل طور پہ انجام دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں یا اس سلسلے میں جانکاری حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ ایک معیاری تاریخی تحقیقی نسب نامہ والی کتاب ہے۔

مذکورہ پہلو اپنی جگہ، لیکن اس کتاب میں بعض چیزیں بہت کھٹکتی ہیں جیسے اس کے سرورق پر حضرت زینب کے مزار کا جو عکس ہے اس میں مقام مصر لکھا ہے، جب کہ اندرون کتاب صفحہ ۹۸ پر ضمناً تذکرہ میں "قناطیر السباع" مصر کو جائے مدفون بتایا گیا ہے، مگر اس پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا مزار ملک شام کے دمشق شہر کے غوطہ نامی جگہ میں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حادثہ کربلا کے بعد یزید کے دربار میں دمشق جانا امر مسلم ہے جب کہ مصر جانا ثابت ہی نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ضرور ہیں، مگر وہ قرین قیاس نہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ عصر حاضر کے مشہور عالم دین مولانا تقی عثمانی نے اپنے سفرنامہ میں بڑی تفصیل سے دمشق میں ان کے مزار کا حال بیان کیا ہے۔ (جہان دیدہ، ص ۲۵۶) اسی طرح حالیہ دنوں میں روزنامہ "انقلاب" نے ۱۲ جون ۲۰۱۶ء کی اپنی اشاعت میں ایک حادثہ کے تعلق سے صفحہ ۱۲ پر تفصیل سے خبر شائع کی کہ شام کے دارالحکومت دمشق کے جنوب میں نواسی رسول حضرت زینب بنت فاطمہ کے مزار کے قریب وہ حادثہ ہوا۔

اسی طرح اصل شاخ حضرت زینب پر بھی معلومات تشنہ ہیں۔ ایک دو جگہ سند میں بھی اضطراب ہے۔ نیز بعض چیزوں کی تکرار بہت زیادہ ہے، پھر بھی ان باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک مستند تاریخی تحقیقی نسب نامہ والی کتاب ہے جو ایک تاریخی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

نام کتاب	:	ڈھلان پر رکے لوگ		
مصنف وناشر:		غیاث اکمل		
اشاعت	:	۲۰۱۵	صفحات :	۱۳۸
قیمت	:	۸۹ روپے		
مبصر	:	ڈاکٹر کلیم اختر		

غیاث اکمل اپنی مشاقیت کے لحاظ سے یقیناً ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں، لیکن مجموعے کے اعتبار سے ابھی نو وارد ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے بعد جھریا کی سرزمین سے ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں غیاث اکمل کا نام سربلند ہے۔ غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی دونوں اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئلہ پتھر میں ہیرا تھے، جس سے پوری اردو فکشن دنیا تابناک ہے۔

PDF Compressor Free Version

غیاث اکمل کی افسانوی شخصیت معاشرتی کریہات کی حامل نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانی استحصالات اور دور حاضر کی کربناکیوں کی بازگشت واضح طور پر سنائی دیتی ہے اور اسی فضائے دروناک میں ان کی افسانوی زندگی سانس لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ گویا غیاث اکمل کے افسانوں کی محتویات ان کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ دراصل غیاث اکمل اپنے افسانوں میں انسانی زندگی اور سماج کی تلخ تر سچائیوں کی تصویر پیش کرتے ہوئے

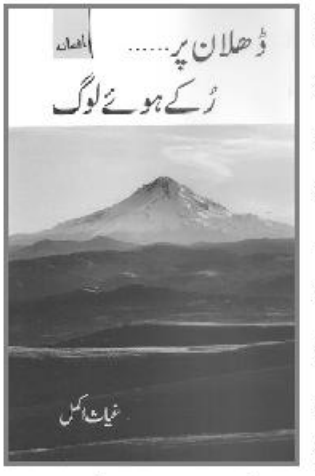

انسان کی بے حسیوں اور مجبوریوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس اولین مجموعے ''ڈھلان پر رکے ہوئے لوگ'' کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں افسانہ نگار نے اپنے افسانوی محرکات کے لیے سلیس اور بامحاورہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ ہندی لفظیات کا استعمال بھی بکثرت ہے، جس کی معنوی حیثیت نہ صرف برقرار رہتی ہے بلکہ بعض اوقات اس کی معنوی وسعت بڑھ بھی جاتی ہے۔

غیاث اکمل اپنی کہانیوں کے لیے اپنے گرد و پیش سے موضوع اخذ کرتے ہیں، اپنے گہرے مشاہدات کی بنا پر افسانے کا تانا بانا بنتے ہیں اور سماج کے تلخ تر حقائق کو اپنے افسانے کے قالب میں تخلیقی طور پر ڈھالنے کی کاوش کرتے ہیں۔ اس طرح سماج کی عصری حسیات کی پلاننگ کرنے میں وہ نمایاں طور پر کامیاب نظر آتے ہیں اور یہی ان کا عین مقصد بھی ہے۔

غیاث اکمل نے اپنے افسانے ''امربیل'' میں ٹریڈ یونین کے عیارانہ سیاسی چہرے کو بے نقاب کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کولیری کے مزدور آج بھی سودخوروں کے چنگل میں پھنسے ہیں۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ یونین کے غنڈے مزدوروں سے جبراً چندہ وصول کرتے ہیں۔ اس کہانی سے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ مزدوروں کی بے حسی آج بھی قائم ودائم ہے۔ آخر یہ بے حسی کب تک قائم رہے گی؟ کیا یہ بے حسی کبھی ختم نہ ہونے والی ہے؟ اپنے آپ میں یہاں، یہ ایک اہم سوال ہے؟ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''مصیبت کے سائے میں جہاں زندگی کی ساری رمق غائب ہو چکی ہے، ساری روشنیاں گل ہیں، لوگ جی رہے ہیں۔ قتل تک ہو جائے، پر روزمرہ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، بہت ہوا تو دکان کے شٹر گر جاتے، لیکن پھر وہی چہل پہل جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو..... کیسا درشیہ تھا..... اس کا بوڑھا باپ بچے کی طرح پھپھک پھپھک کر رو رہا تھا، عورتیں دہاڑیں مار رہی تھیں، چھاتی پیٹ رہی تھیں، بچے سسک رہے تھے اور سود خور ارتھی اٹھانے والوں سے تول مول کر رہا تھا۔'' (''امربیل'' ص ۱۵ و ص ۱۶)

غیاث اکمل نے اپنے افسانے ''جانور'' میں اس بات کو نمایاں کیا ہے کہ انسان اپنے مفاد کے لیے دوسروں کا استحصال کیسے کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ انسان سے وحشی جانور ہو جاتا ہے۔ گائے سے دودھ حاصل کرنے کے لیے نمک بھری پوٹلی گائے کے اندام نہانی میں داخل کر دی جاتی ہے، جس سے جلن اور بے چینی کے سبب گائے دودھ دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح انجکشن، نمک اور طرح طرح کے گھناؤنے طریقے اپنانے سے ظالم باز نہیں آتا۔ اس طرح یہ کہانی انسانی معاشرے میں پیدا شدہ بدعنوانیوں کو نمایاں کرتی ہے۔

افسانہ ''جونک'' میں، جونک ہی مرکزی کردار ہے۔ اس کہانی میں بھینس کی پیٹھ سے خون چوسنے کا عمل بلاشبہ ایک خوبصورت تشبیہ ہے۔ فرقہ پرستی، ذات، پات کی تفریق اور نکسلی تحریک ایک بھیانک آگ بن کر پورے ملک میں سلگ رہی ہے، جس کے لپیٹ میں ہمارا سماج جھلس رہا ہے۔ اسی منظرنامے کو غیاث اکمل نے اپنے افسانے ''ڈستے لمحے'' میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ آج ہر آدمی خوف زدہ ہے۔ اسے ہر لمحہ خوف ستاتا ہے کہ اسے کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ زیر نظر اقتباس سے یہی سچائی اجاگر ہوتی ہے:

> ''پورا علاقہ گہری خاموشی میں ڈوبا تھا۔ دور دور تک کوئی

PDF Compressor Free Version

روشنی نہیں تھی اور نہ کوئی انسان کا پہرا تھا۔ تاریکی ہی تاریکی تھی۔ صرف قیاس کے سہارے بڑھے جا رہا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھتا جا رہا تھا جسم میں کسی غیر مانوس شے کی سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی، بار بار مڑ کر دیکھتا اور ٹھٹھک جاتا، اندھیرے کی وجہ سے رفتار تیز نہیں کر پا رہا تھا..... اچانک کسی نے پشت سے شرٹ کھینچا..... لو دھر لئے گئے۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دھڑکنیں تیز ہو گئیں، رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اب خود سپردگی کے علاوہ کوئی چارا نہیں تھا۔ مڑا تو دیکھا..... کھجور کے ننھے پودے کے کٹیلے حصے سے شرٹ پھنس گیا تھا۔'' (ڈستے لمحے ص ۵۸ و ص ۵۹)

ڈاکٹر حسین الحق اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی آرا سے مجموعے کا ایک Outline ضرور معلوم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر رونق شہری کی تقریظ سے بھی غیاث اکمل کی افسانوی حیثیت اجاگر ہوتی ہے۔

''ڈھلان پر رکے ہوئے لوگ'' کی بیشتر کہانیوں میں وحدت تاثر کی کیفیت تادیر قائم رہتی ہے۔ غیاث اکمل کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے بعض افسانے شروع کرنے کے بعد اختتام پذیر ہونے تک مطالعہ کی دلچسپی مجروح نہیں ہوتی۔ ''امر بیل''، ''جونک''، ''جانور''، ''اپنے حصے کا دکھ''، ''ڈستے لمحے'' اور ''سناٹا'' جیسے افسانے اس لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ غیاث اکمل کی بیشتر کہانیوں کا کہانی پن قاری کو دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ وہ لوگوں کے درد کو سمیٹنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں اور یہ کہنا چاہئے کہ ان کا مجموعہ ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔

نام کتاب	:	آئینہ آج کا	
مصنف	:	سلطان آزاد	
ناشر	:	مکتبہ آزاد، پنولین، گلزار باغ پٹنہ 800007	
صفحات	:	۱۰۴	قیمت : ۲۵۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر محمد اسد اللہ	

انسانی تاریخ ظلم وستم کے واقعات سے بھری پڑی ہے، ہمارے سماج کے مختلف طبقوں اور شعبوں میں اس کی الگ الگ شکلیں نمایاں ہیں۔ عام طور پر کمزور افراد ہی استحصال کے شکار ہوتے ہیں اور اپنی فطری کمزوریوں، سماجی روایتوں اور دیگر وجوہات کے سبب عورت بھی ان میں شامل ہے۔ زیر نظر کتاب ''آئینہ آج کا'' میں طبقہ نسواں پر ہونے والے مظالم کی عکاسی پر اثر انداز میں کی گئی ہے۔

سلطان آزاد کے اس افسانوی مجموعے میں شامل بیشتر کہانیوں کا مرکزی کردار عورت ہے اور ہر کہانی اس کے الگ الگ روپ دکھاتی ہے۔ ان تمام کہانیوں میں عورت کی بے بسی اور مظلومیت مشترک ہے۔ گاؤں کے رسم ورواج، ذات، پات، شوہر کے علاحدہ ہو جانے، طلاق دینے، جہیز کے لئے ستائے جانے یا حادثات کے نتیجہ میں مصیبتوں میں گھر جانے کے مختلف واقعات کے درمیان عورت کو مصنف نے الگ الگ رنگ میں پیش کیا ہے۔ ہر جگہ عورت حالات کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہے، جہاں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔

سلطان آزاد، بہار کے ایک مشہور معروف افسانہ نگار ہیں، ماہنامہ ''شمع'' اور ''روبی'' کے افسانوں کے مطالعہ نے انہیں اس صنف کی طرف مائل کیا۔ ان کی بیشتر کہانیاں مشہور رسائل میں شائع ہوئیں اور ریڈیو سے نشر ہو چکی ہیں۔ ان کی چند تصانیف منظر عام پر آئیں۔ ان میں ''دبستان عظیم آباد'' خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس میں انیسویں صدی کے ربع آخر سے بیسویں صدی کے ربع سوم تک کے شعرا کا تعارف موجود ہے۔ اس کے دوسرے حصہ میں عظیم آباد کے ۳۱ شعرا کو متعارف کرایا گیا ہے۔ اسی طرح بہار میں ''اردو طنز وظرافت'' میں ۳۵ طنز و مزاح نگاروں کی تصاویر اور ۹۰ قلم کاروں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ان کی دیگر تصانیف ''تلاش و تجزیہ'' (تحقیق وتنقیدی مضامین) ''سانچ کو آنچ نہیں'' (بچوں کی کہانیاں) اور ''عظیم سائنس دانوں کی

PDF Compressor Free Version

کہانیاں‘‘ بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

سلطان آزاد کے زیر نظر افسانوی مجموعہ میں انیس کہانیاں ہیں، جن میں چھ افسانچے بھی شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں اختصار کے ساتھ زندگی کے درد و کرب کو مصنف نے عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کے متعلق ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں:

> ’’ان کے یہاں معنویت اور سادگی ہے۔ وہ بیانیہ انداز کو اپناتے ہیں اور کسی بھی طرح کے ابہام کو راہ نہیں دیتے۔ سلطان آزاد تغیرات اور تبدیلیوں کو براہ راست بیان کرتے ہیں۔ محرکات اور جذبات سے اثر پزیری کے تحت ماحول کی سنگینی کہ معاشرتی اور ضمیر کی آواز کے حوالے سے ابھارتے ہیں۔‘‘

’’گود‘‘ اس مجموعہ کی پہلی کہانی ہے، جس میں اولاد کے حصول کی کوشش میں دوسری بیوی پر کی گئی زیادتی کو پیش کیا گیا ہے۔ ’’جھک گیا آسمان‘‘ میں گاؤں میں لڑکا اغوا کر کے زبردستی شادی کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ’’اپنا دکھ میں‘‘ جنسی استحصال، ’’ڈوبتی کشتی میں طلاق کا معاملہ ’’احتجاج‘‘ میں دوسری شادی اور ’’اپنی پہچان میں عورت کی علاحدگی کے بعد حصول تعلیم کے ذریعے اپنی زندگی کو منوانے کی کوشش کہانی کا موضوع ہے، جسے بہت ہی ہنرمندی سے فکری و فنی رنگ روپ دیے گئے ہیں۔ ’’آئینہ آج کا‘‘ کی تقریباً سبھی کہانیاں، ہمارے آس پاس سماج میں پیش آنے والے واقعات کو پراثر انداز میں پیش کرتی ہیں اور ہمیں جہاں عورتوں پر بڑھتی ہوئی زیادتیوں پر دکھ کا احساس دلاتی ہیں، وہیں بار بار یہ سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہیں کہ اس صورت حال کو بہر حال بدلنا چاہیے۔ کتاب خوبصورت انداز میں چھپی ہے، سرورق بہت ہی پراثر اور معنی خیز ہے۔ ❁❁

وقت کا سحر (ص ۴۶ سے آگے)

جنوری کی سرد کہرے بھری شب، دل میں کیسے کیسے طوفان امڈ رہے ہیں، درد کے دہکتے ہوئے شعلوں پر برہنہ پا چلتے چلتے ذرا سی چین کی سانس لی تو سوچوں کے الاؤ دہکنے لگے۔ نرس کہہ رہی تھی:

’’سر آئے تھے میں نے بچی کا بتایا تو باہر سے لوٹ گئے۔‘‘

ایک زور کا جھٹکا لگا، دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ ایک پل کے لئے یوں لگا جیسے دل کی دھڑکن اب رکی کہ تب رکی۔

پاس سوئی نوزائیدہ بچی ذرا سا کلبلائی تو میں نے خود کو سنبھالا۔ اُف.....! یہ کیسے ہمدم کیسے ساتھی ہوتے ہیں، جو ہر پل ہر دکھ سکھ میں ساتھ رہنے کا عہد کرتے ہیں، مگر ایک روز اپنے ہی ہم سفر کو خاروں کی رہ گزر پر تنہا چھوڑ کر خود پھولوں کی راہ اپنا لیتے ہیں۔

ہو سکتا ہے..... دوسری بیٹی کا آنا انہیں ناگوار گزرا ہو کہ انہوں نے بیٹے کی تمنا کی ہو، مگر میں.....؟ میری اذیت تو یکساں ہے ..... درد کے انہی شعلوں پر سے گزرنا تھا، بیٹا ہوتا یا بیٹی.....؟ اور ان کی تو سوچ کبھی ایسی نہیں تھی۔

چادر سے منہ ڈھانپ کر میں چپکے چپکے رونے لگی تھی کہ کسی کا برف سا سرد ہاتھ میری جلتی پیشانی پر آرکا۔ اپنے پن کا احساس دلاتا، عجیب سی توانائی نے مردہ تن میں زندگی کی رمق دوڑا دی..... گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دی۔

’’کیسی ہو.....؟‘‘ آنکھوں میں سمندر امڈ پڑا۔ بڑی بچی روبینہ کو گود سے اتار کر بولے:

’’یہ دیکھو یہ پیاری سی گڑیا اللہ نے تمہارے لئے بھیجی ہے۔‘‘

نرس چہکتی ہوئی بتا رہی تھی:

’’سر مٹھائی لینے چلے گئے تھے، سب کو انعام بھی دیا ہے۔‘‘

ساری جلن، تمام تھکن پل بھر میں غائب ہو گئی۔

سوچوں کی آندھیاں کہاں کہاں اترائے جا رہی ہیں، میں ریاض کے عبید ھو سپیٹل میں بیٹھے بیٹھے کانپور کے ایرفورس ھوسپیٹل کیسے پہنچ گئی۔؟ شابی کی پیدائش کی وہ صبح کیسے یاد آگئی کہ آج شابی خود اسی درد کے سمندر سے گزر رہی ہے۔

وقت گزرا ہی نہیں ہے، سمٹا بھی ہے۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

ادبی سرگرمیاں

اردو مشاورتی کمیٹی کی اہم نشست

پٹنہ: گزشتہ دنوں اردو مشاورتی کمیٹی کی چوتھی عام نشست کا مقامی ابھیلیکھ بھون میں انعقاد ہوا۔ اس موقع پر کمیٹی کے صدر نشیں جناب شفیع مشہدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہمیں یہ بتاتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ ہم نے گزشتہ ایک سال کے عرصہ میں اردو مشاورتی کمیٹی کو آپ حضرات کے تعاون سے بے حد فعال بنایا ہے اور آج ریاست بہار میں اس کی ایک اپنی شناخت قائم ہو چکی ہے۔ اس کے لئے اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی بھی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ہمارے مشورے پر عمل درآمد کرتے ہوئے ہر ضلع میں فروغ اردو سمینار اور اردو عمل گاہ کے انعقاد کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ جناب مشہدی نے مزید کہا کہ اردو مشاورتی کمیٹی پورے بہار میں اردو کے فروغ کے لئے ماحول سازی کا کام کرے گی۔ انہوں نے اس موقع پر رجسٹری آفس میں اردو فارمیٹ جاری کرنے، مہاتما گاندھی نیشنل یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کرنے، کمیٹی کے اراکین کے اعزازیہ میں اضافہ کرنے، اردو ٹی۔ای۔ٹی اساتذہ کی جلد بحالی کرنے کی تجاویز پیش کیں جنہیں اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ نشست میں نائب صدر نشیں ڈاکٹر مشتاق احمد اور اراکین کمیٹی میجر بلبیر سنگھ بھسین، پروفیسر توقیر عالم، ڈاکٹر محمد اعجاز احمد، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر سید احمد قادری، پروفیسر قمر جہاں، شاہ بلال احمد قادری، اسد رضوی، ڈاکٹر ریحان غنی، عبدالحنان سبحانی، افضل حسین، شنکر کیموری نے شرکت فرمائی اور تمام ایجنڈوں پر اپنے اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کیا۔ اس موقع پر ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) محمد خورشید عالم انصاری بھی شامل تھے۔ اردو مشاورتی کمیٹی کے رکن سکریٹری اور ڈائرکٹر (اردو) امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ آپ حضرات کے تعاون سے پوری ریاست میں اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی اور ماحول سازی کے لئے ہر طرح کوشاں اور پابند عہد ہے۔

اس موقع پر ایک سوال کے جواب میں بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کہا کہ اگر مجھے مدرسہ کی نصابی کتابیں دستیاب کرا دی جائیں تو میں اس کی اشاعت کے لئے تیار ہوں بلکہ میں یونیورسٹی کی برسوں سے عدم دستیاب اردو کتابوں کو بھی شائع کرانے کو تیار ہوں۔ نشست کے اختتام پر صدر نشیں موصوف نے کہا کہ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسے اپنی زندگی اور عمل میں اُتاریں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اکادمی میں پرچم کشائی

پٹنہ: یوم آزادی کے مبارک موقع پر حسب روایت بہار اردو اکادمی میں پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ پرچم کشائی کی رسم اکادمی کے سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے انجام دی۔ سکریٹری موصوف کے علاوہ اکادمی کے نائب صدر جناب سلطان اختر نے بھی اس تقریب میں حصہ لیا۔ اس موقع پر اکادمی کے جملہ کارکنان کے علاوہ دیگر مہمانوں نے بھی شرکت کی۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

سلام و پیام

☆ ''زبان وادب'' کا اگست ۲۰۱۶ء کا شمارہ ملا۔ شکریہ، اردو ''زبان و ادب'' کے تعلق سے آپ کی وسیع النظری اور فراخ دلی یقیناً تاریخ ساز ہے۔ ہندوستان کی کسی بھی اردو اکادمی نے آج تک وہ کام نہیں کیا جو آپ نے بلند حوصلوں کے ساتھ کر دکھایا ہے۔ خصوصاً پروفیسر نجم الہدیٰ، خورشید سمیع اور پروفیسر ناز قادری کی ہمہ جہت اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ نے انہیں اعزازات سے سرفراز فرمایا ہے۔ پروفیسر نجم الہدیٰ نے سترہ سال مدراس یونیورسٹی میں گزارے آج تمل ناڈو میں پروفیسر کی جونسل ہے وہ حضرت موصوف کی تربیت کردہ ہے۔ زیر نظر شمارے میں ''تخلیقیت اور شاعری کا طلسم'' کے مطالعہ کے دوران آغاز مضمون کے چند جملے ''یوں تخلیقیت ہر شخص میں ہوتی ہے یہ وہبی بھی ہوتی ہے اور کسبی بھی'' پڑھتے پڑھتے ان جملوں پر ذہن میں ایک سوال نے سر اٹھایا تو مجھے چند لمحوں کے لئے رک جانا پڑا۔ تخلیقیت کیا ہے؟ اور شاعری کیا ہے؟ وہبی کیا ہے؟ اور کسبی کیا ہے؟ ان دونوں لفظوں کے لغاتی معنی میں نے یہ معلوم کئے کہ ''تخلیق'' یعنی پیدا کرنا اور اس پیدائشی عمل کو صفحہ قرطاس پر لانے میں خداداد کیفیت ہی تخلیق کار یا شاعر کا ساتھ دیتی ہے۔ اب مجھے صاحب مضمون سے یہ وضاحت جاننی ہے کہ تخلیقیت کیا ہے؟ تخلیق اور شاعری ایک تخیلاتی عمل کا نام ہے۔ چاہے وہ مشاہداتی ہو یا تجرباتی۔ صرف اور صرف شاعری کی صورت میں ہی اظہار کی صورت اختیار کرتی ہے، پھر اپنے مضمون میں موصوف نے وہبی اور کسبی والی بات نکالی ہے۔ ''وہبی اور کسبی'' دونوں لفظوں کی معنی ہم نے لغات میں یوں دیکھے۔ ''وہبی'' قدرت کی طرف سے عطا کردہ اور ''کسبی'' اپنی کوشش سے تخلیق کیا گیا۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ اپنی کوشش جو دل کو چھونے والے اشعار یا افکار کی صورت میں ہوتی ہے۔ کیا یہ خداداد نہیں ہوتی۔ آگے چل کر موصوف تخلیقیت اور شاعری کے تعلق سے خلاصہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں کہ تخلیقیت بیج ہوتی ہے اور شاعری اس کا پودا۔ اگر بیج رومانی بویا جائے تو اس کے پھل پھول اور پتے بھی رومان پرور ہی ہوں گے۔ اگر بیج کی فطرت میں انقلابیت ہو تو شاخ و ثمر بھی انقلابی رنگ کے ہوں گے، لیکن اس نظریے کو مزید تصرف کی صورت دیتے ہوئے یوں کہیں کہ تخلیق کا عمل شاعر، مصور، سنگ تراش، بت تراش اور آرکیٹیکٹ انجینئر یعنی ہر فن کار کے اندر یہ عناصر پیدائشی ہی ہوتے ہیں جو تخلیق و تعمیر کی صورت میں منصۂ شہود پر آتے ہیں جیسے بت تراش کی نظر جب کسی پتھر پر پڑتی ہے جو اس کے تیشے کے لئے قابل تراش ہو جائے تو وہیں سے اس پتھر میں وہ ایک شکل پیدا کر لیتا ہے پھر یہ شکل دیوی، دیوتا، عورت مرد، چرند پرند کے پیکر میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتی ہے اسی طرح شاعر جو بنتا نہیں قدرت کی طرف سے پیدا ہوتا ہے اس کا شعور ہر دم رواں دواں رہتا ہے جب وہ رومان پرور ماحول سے گزرتا ہے تو رومانی اشعار کہنے لگتا ہے اسی طرح جب وہ آشوب ناک حالات سے دوچار ہوتا ہے تو انقلابی یا انتشاری جذبات کی عکاسی کرتا ہے تو یہاں تخلیقیت اور شاعری کے طلسم دونوں میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ تخلیقیت بھی وہی ہے، شاعری بھی وہی ہے۔ مصور بھی وہی، تصور بھی وہی، جو ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ آگے چل کر مضمون نگار نے جدید اور مابعد جدید کا بھی تذکرہ کیا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جدید کیا ہے؟ مابعد جدید کیا ہے؟ اور اردو ادب کا پہلا وقت کیا ہے؟ دوسرا وقت کیا ہے؟ وقت تو وہی ایک ہے جو روز اول سے شروع ہوا اور موجودہ دور غزل کی صورت میں غزل گو نے اس کو ڈھالا ہے۔ وقت اور وقت کے اتار چڑھاؤ کا دارومدار ہمارے عمل پر ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی اچھے کام کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور مضر عمل کے لئے بھی۔ اچھے خیالات اور جذبات اچھے اشعار کا ہی روپ دھارتے ہیں۔ برے خیالات ہیجان پیدا کرنے والے اشعار کی شکل پیدا کرتے ہیں اور ہر شاعر اپنے دور کا مجدد اور موجد ہے۔ غالبؔ بھی اپنے دور کا اچھا شاعر تھا۔ وہ اپنے دور کے حالات اور اپنے مافی الضمیر کو شعر کی صورت عطا کرتا رہا۔ ن۔م۔ راشد

PDF Compressor Free Version

اور میرا جی جہاں اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات کو جنسیات کا روپ بخشتے رہے (حلقہ ارباب ذوق کا گروپ) وہیں ترقی پسند شعرا اور جدیدیت کے گروپ نے انقلابی اور روایاتی قدروں سے ہٹ کر خیالات کا اظہار اپنی نظموں اور غزلوں میں کیا ہے تو یہاں جدید اور مابعد جدید کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ یہ تینوں گروپ کے شعرا اپنے اپنے منفرد لہجے، منفرد تشبیہات اور استعارات کی صورت میں اچھے شاعر بن کر منظر ادب پر آئے۔ بہر کیف میرے ان خیالات کا ماحصل صرف اور صرف تخلیقیت ہی ہے اس میں شاعری طلسم کی بات اجاگر نہیں ہوتی۔ ''حرف آغاز'' یقیناً موثر اور قابل دعوت فکر ہے کہ ہم آج آزادی کے ۷۰ سال گزار چکے ہیں ان ۷۰ سال میں صرف انگریزوں کا ایک دور ہی ختم ہوا ہے اور اس فرنگی دور کی غلامی سے بھلے ہی ہم آزاد ہوئے، لیکن فرقہ پرستی، بدعنوانی، سلوک عصبیت، بدلے کی جذباتیت کی غلامی سے آج بھی چھٹکارا نہیں پایا۔ اس آزاد غلامی کی زنجیریں ہنوز ہمارے دست و پا کو جکڑی ہوئی ہیں، اگر ہم مسلمان ٹھنڈے دل سے سوچ کر حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ہو جائیں اور اسلام کے اتحادی اصول کو اپنا لیں اور مسلک پرستی کے مہلک مرض سے رستگاری حاصل کر کے اسلام کے امن و سلامتی کے پیغام کو حکمراں جماعت کے ساتھ جوڑ لیں تو بے شک ۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی بھی پریت میں ہے

اقبالؔ کے اس شہرہ آفاق پیغام کے مشعل بدست حامل ہو سکتے ہیں یا جگرؔ مرادآبادی کے اس سہل اور سحر خیز شعر کو تھوڑے طور پر اپنا لیں ۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

علیم صبا نویدی، چینئی

☆ مجلہ ''زبان و ادب'' کے اگست ماہ کا شمارہ دیدہ زیب و جاذب نظر سرورق اور معیاری مشمولات کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ اس بار اداریے میں پیروں، فقیروں، سادھو، سنتوں کی بتدریج گرتی ہوئی ''امیج'' اور دور حاضر کے حالات کی ابتری وغیرہ کی جس طرح سے مدیر صاحب نے خط کشی کی ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہو سکتا ہے اور یہ وقت کا واقعی تقاضا بھی ہے۔ معین الدین عثمانی صاحب کے افسانے ''حیات انسانی کا نوحہ'' کا اول لفظ ''شارع'' ہی فقرے میں معنی کے لحاظ سے متنازع فیہ ہے۔ دوئم کالم میں بھی بریڈ کے ''سلایز'' لفظ کی بجائے ''سلایسیز'' (slices) لفظ کا املا درکار تھا۔ اس افسانے میں دور حاضر کے حالات کی تبدیلی پر افسانے کے راوی کا پے در پے تبصرہ کرتے جانا قابل تائید و مدح ہے۔ افسانہ نگار حیات انسانی کے تغیرات اور تضادات کو بخوبی رقم کرتا چلتا ہے اور یہی اس افسانے کا خاص جمع نقطہ گردانا جا سکتا ہے۔ غزالہ پروین کے افسانے ''ملن'' میں ایک نیک سیرت بیوی کی اپنے خاوند کے تئیں محبت کا سمندر اول تا آخر موجزن رہتا ہے۔ خاوند کے بغیر رہنا اور لمحہ لمحہ کاٹنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ جبراً اپنے جذبات کو دبائے رکھتی ہے۔ ازدواجی زندگی کے اس نازک پہلو کی نسوانی نظریے سے عکاسی اس سے قبل بہت کم اور قلیل افسانوں کا ہی موضوع رہی ہے۔ مستزاد افسانے کا عنوان ''ملن'' موضوع کے لحاظ سے نہایت ہی موزوں ہے اور ملن کی خصوصی گھڑیوں کا آئینہ ٹھہرتا ہے۔ غزالہ قمر اعجاز کے افسانے میں اگر ہیرو اور راوی آصف ہے، تب اس فقرے میں اس کی بجائے راوی ارشد کیوں ہو جاتا ہے: ''آصف بھائی کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہیں۔'' (ص ۳۹ و ص ۴۰) پر محاورے ''ٹیڑھی کھیر'' کو ''مشکل کھیر'' کرنا بے طرح کھٹکتا ہے۔ اگلے صفحہ ۴۱ پر ''اور ٹائم'' الفاظ کی جگہ ''اوور ٹائم'' درکار تھے۔ انور زبیر کے افسانے ''بدلتے رشتے'' میں ایک نیک شعار عورت ریشما کے دوئم نکاح کے بعد خود اعتمادی اور پہلے خاوند فرمان کے ملنے پر اس کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آنا قدرتی عمل ہے اور آزادئ نسواں کی تحریک کے بموجب بھی ٹھہرتا ہے۔ قیصر زاہدی کے افسانے ''کاش'' کے تحت شراب نوشی کے ساتھ ساتھ بھوت پریت چڑیل وغیرہ سے متعلق توہم پرستی کے نقصانات پر بھی کاری ضرب کی گئی ہے۔ عنوان کے ہی بموجب ''کاش'' ان دونوں بری عادات سے لوگ آزاد ہو پاتے! اس افسانے کے اول صفحہ ۴۶ پر بہت سی اشیا گنانے کے بعد ''اور سگریٹ دستیاب رہتا'' لکھنا غلط ہے۔ فعل

PDF Compressor Free Version

''رہتے'' چاہئے تھا۔ اتر پردیش کے مشہور صحافی، ناقد وطنز ومزاح کے بادشاہ فضل حسنین نے اپنے انشائیے میں انسانی فطرت کے بموجب ہر وقت احتیاط برتنے کے خبط کے ساتھ ساتھ انتہا پسندی کے جذبے کو خاصہ آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ طنز کا نشانہ بنے دوست کے لیے ''محتاط صاحب'' کا خطاب مضحکہ خیز ہونے کے علاوہ مزاح کا بھی خاصہ مزہ دے گیا ہے۔ واقعی حد سے زیادہ احتیاط نقصان دہ بھی ہو جایا کرتی ہے، اس کی اس طرح سے پہلی بار خط کشی دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ صفحہ ۴۹ پر ''مقالہ'' لفظ کا املا ''مقابلہ'' چاہئے تھا۔ ٹھیک اسی طرح جناب سعید رحمانی کی دونوں غزلوں میں بھی طنز ومزاح کی ترشی کے ساتھ نصیحت آموزی دیکھتے ہی بنتی ہے۔ مجلّہ ''زبان وادب'' کے جولائی ماہ کا شمارہ بھی دیدہ زیب وجاذب نظر سرورق اور معیاری مشمولات کے ساتھ باصرہ نواز ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر نگہت نسیم کے افسانے 'کریلے' میں والدہ کی اپنے اکلوتے فرزند سہیل کے تئیں دلی انسیت ومحبت کا غالباً پوشیدہ اظہار افسانے کے اختتام پر کسی فوارے کی مانند پھوٹ پڑتا ہے۔ اسی کو نفسیات میں ایسوسیشن (Association) کے اصول کی اصطلاح سے عبارت کیا گیا ہے۔ کڑوے کریلے ایک ماں کی میٹھی محبت کے مظہر بنا کر بخوبی نشان زد کیے گئے ہیں۔ شاکر کریمی کے افسانے ''زخم اور مرہم'' کے تحت افسانے کے نامعلوم کاری (نیریٹر Narrator) کی ہیروئن فرحت کے ساتھ جس محبت کی خط کشی ہوتی رہی تھی، اسی کے ساتھ شاہد کی ہمشیرہ کی صورت میں ایک ناقابل قبول تعلق محسوس ہوتا ہے۔ یہ مصنوعی اختتام افسانے کی شریانوں سے اخذ نہیں ہوا ہے، لہٰذا یہ افسانہ فنی اعتبار، بالخصوص کردار نگاری کی رو سے خاصا ہلکا ہی رہ گیا ہے۔ راجہ یوسف کے افسانے زیر عنوان ''مہیز'' میں موجودہ انسانی حیات کے اطراف میں دولت کی ہی برتری وبالادستی نظر آتی ہے۔ وہیں افسانے میں معمرہ راشی کے ساتھ اس سے کم عمر کے عرفان کا میاں بیوی کا رشتہ قائم کر کے ازدواجی زندگی کا آغاز کرنا عصری زندگی کی حقیقی عکاسی کی آئینہ داری ہے۔ یہ تخلیق حفیظ جالندھری کی مشہور نظم ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کی بھی یاد دلاتی ہے اور مستزاد اس ضرب المثل کے بھی مصداق ٹھہرتی ہے۔ ''باپ بڑا نہ بھیا، سب سے بڑا روپیہ!'' ڈاکٹر نریش نے شہرۂ آفاق افسانہ نگار کرشن چندر کے سوانح حیات کے ایک واقعہ کی نقاب کشائی تو کی ہی ہے، مزید ان کے قلم سے یہ گزارش بھی کرنے کی تلقین کرتی ہے کہ یہ موصوف سے متعلق ایک ضخیم کتاب ضرور لکھ کر قارئین کی معلومات میں قابل مدح اضافہ کریں۔ اس مضمون میں ان کا یہ مقولہ زرین الفاظ میں رقم کرنے کے لائق بن پڑا ہے۔ ''اردو اپنے شیدائیوں کا ماتھا چومتے وقت یہ نہیں دیکھتی کہ اس پر تلک کا نشان ہے یا سجدے کا۔'' (ص ۲۶)

کرشن بھاوک، پنجاب

☆ ''زبان وادب'' اگست ۲۰۱۶ء ملا۔ مجھے خاص طور سے جناب انوار الحق تبسم صاحب کا مقالہ ''پورنیہ، تہذیب وثقافت کے کچھ پہلو'' بیحد پسند آیا۔ اس مقالہ میں سنجیدگی ہے اور تاریخی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ میری ناقص رائے ہے کہ محترم جناب انوار الحق تبسم صاحب کشن گنج کو بھی شامل کر لیں تاکہ معلومات میں مزید اضافہ ہو سکے۔

(ڈاکٹر) محمد صلاح الدین، کشن گنج

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ اگست ۲۰۱۶ء پیش نظر ہے۔ سرورق اور آپ کا اداریہ آزادی کے تعلق سے ہے جو دعوتِ غور وفکر عطا کرتا ہے۔ مضامین کا حصہ بڑا ہی دقیع ہے تمام مضامین پسند آئے۔ اس شمارے میں پانچ کہانیاں ہیں۔ کہانیوں کا انتخاب بھی عمدہ ہے اب کس کس کے نام لکھوں ''جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے'' انور شمیم کی آٹھ نظموں سے شعری حصہ کی شروعات ہے۔ انور شمیم کی کچھ نظمیں اچھی لگیں، کچھ نظمیں گنجلک ہیں جو شاید میری سمجھ سے پرے ہیں، ممکن ہے وہ بہت اچھی ہوں۔ اپنی نظموں میں تحسین گیلانی اور سلیم شہزاد بھی کامیاب ہیں۔ غزلوں میں محترمہ نصرت مہدی محترمہ سیدہ شان معراج، سید ضیاء الرحمٰن ضیاء، ڈاکٹر ذکی ہاشمی اور محترمہ شبانہ عشرت کامیاب ہیں۔ انجم باروی کی رباعیات اچھی ہیں مگر پہلی رباعی کا تیسرا مصرع کچھ عجیب سا ہے۔ شاید کمپوزنگ کی غلطی ہو۔ آر۔ کے روشن کے دوہے بس یوں ہی سے ہیں۔ تبصرے ٹھیک ہیں۔ تاثرات کا کالم بھی بہتر ہے۔ آخری سرورق پر مظفر پور میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کی تصویریں دے کر آپ نے اچھا کیا۔ آپ کا یہ

PDF Compressor Free Version

پروگرام لائق تحسین ہے۔آپ اچھا کام کررہے ہیں آپ سے اردو طبقہ کو بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ خدا کی ذات سے یقین ہے کہ آپ اردو طبقہ کے امیدوں پر کھرا اتریں گے۔

فردوس گیاوی، گیا

☆ ''زبان وادب'' اگست ۲۰۱۶ء کا دیدہ زیب ترنگا شمارہ زینت نظر ہوا۔ ادارت کا افسانوی آغاز اچھا لگا۔ مدیر کا فکشن نگار ہونا رسالے کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ ابوالکلام قاسمی صاحب کا معیاری مضمون پڑھ کر پتا چلا کہ سردار جعفری صاحب نے تین سطحوں پر ترقی پسند تحریک سے اپنی سرگرمیوں کی وابستگی جاری و ساری رکھی۔ طیب صدیقی صاحب کا مقالہ لائق احترام ہے، اس طرح کی چیز شماروں میں ہونی چاہئے۔ طیب صاحب نے اپنے نوٹ کا حق ادا کردیا ہے۔ قدوس جاوید صاحب کا مضمون ہم جیسوں کے لئے انتہائی کارآمد ہے، طویل ہے، مگر معلوماتی ہے۔ پورنیہ کی طرح اگر بہار کے ہر شہر کا تہذیبی اور ثقافتی پہلو پیش کیا جائے تو ایک اچھا قدم ہوگا یہ کام انوار الحق صاحب کی طرح دیگر قلم کاروں پر منحصر کرتا ہے۔ عثمانی صاحب کے افسانے کے انجام کے مطابق افسانے کا عنوان کچھ اور ہونا چاہئے تھا۔ غزالہ پرویز صاحبہ کے افسانہ ''ملن'' میں بھرپور افسانویت ہے، پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ محترمہ انور نزہت کا افسانہ ایک خاص موڈ کا بہترین افسانہ ہے۔ قیصر زاہدی صاحب بچے اور بڑے دونوں کا خیال اپنی تخلیقات کے ذریعہ رکھتے ہیں۔ ''کاش'' پڑھتے وقت مجھے کہیں کہیں شفق صاحب کی یاد آرہی تھی۔ فضل حسنین صاحب کا ''ضبط'' ذہنی بوجھل پن کو بخوبی دور کرتا ہے۔ شاعری کے حصے میں انور شمیم جاناں کی صرف آخری نظم متاثر کرتی ہے۔ سید تحسین اور سلیم شہزاد قدرے اچھے لگے۔ اختر قادری صاحب کو ان کے عمدہ کلام کے لئے سلام پیش کرتا ہوں۔ نصرت مہدی کی پہلی دونوں غزلوں کا مطلع پسند آیا، شان معراج صاحبہ کی فنی شان کا کیا کہنا۔ اب مری فتح کی جگہ اگر ''کم مری فتح کے آثار نظر آتے ہیں'' ہوتا تو میرے خیال سے مطلع اور جاندار ہوجاتا۔ ضیا صاحب کی شعری ضیا استفادہ کرنے کے قابل ہے۔ سعید رحمانی صاحب کی پہلی غزل کا پیغامی مطلع بہت خوب ہے نیز پوری غزل کامیابی کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر ذکی ہاشمی بھائی میرے انقلابی دوست ہیں اچھا کہتے ہیں اور اچھا پڑھتے ہیں۔ ابرار احمد اجراوی کا تبصرہ بھرپور ہے۔ اکادمی آپ تک کی تعریف واقعی دفتر چاہتی ہے۔ ''مگر مچھ کا شکار'' محترمہ سرتاج بانو کی ذہانت کی علامت ہے۔ فراغ روہوی صاحب نے علامہ کے مصرع سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، چیز برمحل اور بہتر ہے۔ حضرت علی کا فرمان نعمت شمارہ ہے۔ جوہر نوری صاحب کی نظم بچوں کے لئے اچھی ہے۔ دیگر چیزیں بھی قابل توجہ ہیں۔ آپ کا حب الوطنی پر مبنی اداریہ پڑھ کر بقول والد بزرگوار ۱۴/اگست ۱۹۴۲ء کے سہسرام کا بیانیہ واقعہ یاد آگیا۔ اس بار کے شمارے کی بائنڈنگ اطمینان بخش ہے۔ کاغذ اور چھپائی عمدہ ہے۔

شکیل سہسرامی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' اگست ۲۰۱۶ء باصرہ نواز ہوا۔ مجلہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ صوری و معنوی دونوں لحاظ سے مجلہ باعث تحسین ہے۔ ''یوم آزادی'' کی مناسبت سے اداریہ قابل مطالعہ ہے۔ پروفیسر طیب صدیقی کا مقالہ ''مولانا بشارت کریم'' اور ڈاکٹر تحسین فاطمہ کا مقالہ ''نثریات شبلی کی عظمت فراواں'' پسند آیا۔ افسانے میں ''کماؤپوت'' اور ''بدلتے رشتے'' کافی دلچسپ ہیں۔ فضل حسنین کا مزاحیہ مضمون ''احتیاط کا خبط'' مختصر ہونے کے باوجود لائق تحسین ہے۔ نظمیں اور غزلیں بھی خوب ہیں اور تبصرے بھی معیاری، خصوصاً ڈاکٹر تسیم اختر کا تبصرہ بھرپور ہے۔ کہکشاں توحید نے نرگس جہاں کی کتاب ''دہلیز'' پر بھرپور تبصرے کی کوشش کی ہے، لیکن چند باتیں توجہ طلب ہیں مثلاً تبصرہ نگار نے افسانہ ''تہی داماں'' کا عنوان ''شہرداماں'' لکھ دیا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''ممتا کی زنجیر'' کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ نرگس جہاں کے افسانے یاسیت کے قریب ہیں۔ حالانکہ ان کے افسانے میں یاسیت کہیں نہیں ہے۔ تبصرے میں ایک جگہ وہ اپنے ''جگر کے ٹکڑے کی بے بسی برداشت کرسکتی'' کی جگہ تلخ بات برداشت نہیں کرسکتی لکھا جاتا تو بہتر تھا۔ تبصرہ نگار نے آخر میں لکھا ہے کہ ''تصحیح کا پورا حق ادا نہیں ہوسکا'' اسے یوں کہا جاتا تو مناسب تھا کہ پروف ریڈنگ پر مزید دھیان کی ضرورت تھی جو نہیں دی گئی۔ مبصر نے

PDF Compressor Free Version

افسانوں کی تعریف کے ساتھ ساتھ ان کے عیوب کی بھی نشاندہی کی ہے۔ گویا تلمیح ملیح سے کام لیا ہے جو شاید مبصر کا حق ہے۔

نورالہدیٰ شمسی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' کا اگست ۲۰۱۶ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ ''حرف آغاز'' کے تحت آپ کے اداریہ نے آنکھوں میں آنسو بھر دیئے۔ بہت بہت شکریہ کہ آپ نے علمائے صادقپور کا بھی ذکر کیا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ غیر تو غیر خود اپنے ان مجاہدین اور جاں نثاران وطن کو یکسر بھول گئے جن کی جدوجہد اور سرفروشیاں مثالی ہیں۔ اس تاریخی تحریک سے وابستہ صادقپور کے مہاجرین، شہیدا اور ستم زدہ اشخاص کی قربانیوں تاریخی حقائق کی روشنی میں اس تحریک کے اہم پہلوؤں پر جامع کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(ڈاکٹر) سید اشرف اسمٰعیل صادق پوری، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ ماہ جولائی ۲۰۱۶ء ملا۔ شکریہ ''حرف آغاز'' میں آپ نے جوگندر پال کی شخصیت پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اس سے طبیعت سیراب ہوگئی۔ آپ بہار میں اردو کے لئے جس طرح کام کر رہے ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ دیپک بدکی، بدنام نظر، احمد علی جوہر، سلمان عبدالصمد سبھی کے مضامین خوب ہیں۔ آج انٹرنیٹ اور موبائل کے زمانے میں خط وکتابت بہت مشکل کام ہوگیا ہے، لیکن آپ ''سلام و پیام'' کے نام سے قارئین کو بھی جوڑے ہوئے ہیں، اس کے لئے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ علیم صبا نویدی، تبسم فاطمہ کی نظمیں اور ظفر اقبال ظفر، ڈاکٹر ذکی طارق اور شارق عدیل کی غزلیں اچھی ہیں۔ معیاری رسائل کی فہرست میں زبان وادب سرفہرست ہے اس کے لئے تمام اراکین مجلہ کو مبارکباد۔ آپ نے اردو کے اس شجر کو پھل دار بنا دیا ہے، اردو والے اس کے حرے اور سائے سے مستفید ہوتے ہیں۔

احد پرکاش، بھوپال

☆ جولائی کا ''زبان وادب'' ملا۔ اردو ادب کے بڑے فکشن نگار جوگندر پال کا ذکر آپ نے اپنے اداریے میں بہت موثر انداز میں کیا ہے، یہ بالکل درست ہے کہ ان کی کمی اردو ادب کی دنیا میں ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ یہ اردو ادب کی بدنصیبی ہے کہ زندگی میں ان کی جو خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہوئی، البتہ یہ بہت اہم بات ہے کہ بہار اردو اکادمی کا سب سے بڑا ایوارڈ ''شاد عظیم آبادی'' ایوارڈ ان کی زندگی میں ان کو دیا گیا تھا، جو ان کے علاج ومعالج میں کام آیا۔ جوگندر پال کا گوشہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ زیر نظر شمارے میں ان پر سارے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ دیپک بدکی صاحب کا مضمون ''جوگندر پال کے افسانے: مٹی کا ادراک کے حوالے'' سے بہت ہی معلوماتی ہے، انہوں نے جوگندر پال کے افسانوں اور ناول کے حوالے سے جاندار تحریر میں جوگندر پال کی شخصیت اور ان کی فنکارانہ صلاحیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان کے افسانچے پر بھی دیپک بدکی کا تبصرہ بے حد متاثر کرتا ہے۔ بلاشبہ جوگندر پال کبھی بھی فراموش نہیں کئے جانے والے فکشن نگار تھے۔ وہ ایک صوفی سنت انسان تھے، وہ ایک منفرد اسلوب کے کہانی کار تھے۔ انہوں نے درجن بھر افسانوی مجموعے اور سات ناول/ناولٹ اردو ادب کو دے، جوگندر پال جیسی باوقار شخصیت عرصہ بعد بھی پیدا ہونا مشکل ہے۔ اردو والوں نے واقعی ایک عظیم فنکار کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی یہ بدنصیبی جاری ہے۔ آپ نے انتہائی خلوص اور محبت سے جوگندر پال کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس سے پہلے کے شمارے جون ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن پر بھی آپ نے اپنے دلی جذبات واحساسات کو سپرد قلم کیا ہے۔ شکیل الرحمٰن بابائے جمالیات تھے۔ وہ فلسفہ جمالیات کے موجد بھی قرار پاتے ہیں۔ ان کی جمالیاتی تنقید نا قابل فراموش رہے گی وہ ایک تخلیقی فنکار تھے، اردو ادب کے وہ منفرد جمالیاتی ناقد۔ آپ نے اپنے اداریے میں بابا سائیں کا جس دکھ بھرے انداز میں ذکر کیا ہے، وہ قارئین کو رلا دیتا ہے۔ ۲۷ر اپریل کو اردو اکادمی نے اپنے سب سے بڑے اعزاز سید سلیمان ندوی ایوارڈ سے ان کی زندگی میں ان کو سرفراز کیا تھا۔ یہ بہت خوش قسمتی تھی آپ کی اور رخصت ہوتے وقت ان کا یہ کہنا ''نوری صاحب آپ مجھے بھولئے گا نہیں'' اور آپ کی چھٹی حس نے آپ کو بتا دیا تھا کہ شاید یہ آپ کی ان سے آخری ملاقات ہے۔ اس درد بھری داستان کے حوالے سے

PDF Compressor Free Version

آپ نے اپنے اداریہ میں ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے'' میں اپنے دلی درد وغم کا جو اظہار کیا ہے وہ بڑا جاں گداز ہے۔ ان کے جنازے میں لوگوں کی تعداد پر آپ نے صحیح تحریر کیا ہے کہ ''ہمارے اندر سے بزرگوں کا احترام ختم ہوگیا ہے۔'' ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں اب سوائے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہم یہ فراموش کر گئے ہیں کہ ایک دن ہم سب کو خاک بسر ہونا ہے۔ خلیل الرحمٰن پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ ایسی بڑی شخصیت کو کبھی بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ ''زبان وادب'' کے جون کے شمارے میں ان پر گوشہ آپ نے شائع کیا اور اچھے مضامین بھی شامل اشاعت کر لئے یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ اردو ادب میں بابا سائیں جمالیات کے لیجنڈ اور واحد ناقد ہیں اور ان کی کتابیں نادر ہیں۔ وہ اردو ادب میں ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔ آمین۔

شمس فریدی، جمشید پور

☆ ''زبان وادب'' جولائی ۱۶ء کا شمارہ ادبیت سے بھرپور ہے۔ جوگندر پال پر بدنام نظر کا مضمون ''صوفی صفت افسانہ نگار'' بہت اچھا لگا۔

صادق علی انصاری، سیتاپور

☆ مئی کا مجلّہ ''زبان ادادب'' حسب سابق اپنی روایت کے مطابق مطالعہ کا کافی سامان بہم کرتا ہے۔ آپ کا اداریہ اور غضنفر کا مضمون موجودہ اردو صورت حال کی النسا کی کا اچھا خاصہ جائزہ ہے۔ میں اس کے لئے صرف اہل اردو کو ہی ذمہ دار نہیں سمجھتا کہ ان کو مادری زبان سیکھنے سے ہی کسی نہ کسی طریقے سے روکا جارہا ہے۔ اردو کی بنیادی تعلیم (پرائمری، سکنڈری اور اونچی سطح) کی خانہ خرابی کے لئے پورے نظام تعلیم کو کمر بستہ کیا جا چکا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کو پریم چند کے ساتھ اس طرح منسلک کر دیا گیا ہے کہ کوئی انہیں ایک الگ اور بہتر افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا۔ نہ ہی کوئی ماننے کو تیار ہے، متھن کمار نے بھی یہی کچھ کیا ہے۔ صاحب مضمون نے بے جڑ کے پودے کا ذکر ہی نہیں کیا۔ کیا پریم چند ایسا طویل افسانہ لکھ سکتے تھے کیا یہ ان کے بس کی بات تھی؟ میں ایسا سمجھتا ہوں، لیکن کوئی ضروری نہیں کہ میرے خیال سے دوسرے بھی اتفاق کریں۔ سلیم شہزاد کی نظم بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ اسے کہتے ہیں تخلیقیت۔ شائستہ نوری کی تحریر کبوتر بہت دلچسپ ہے اور معلومات افزا۔ اپنی تہذیب میں کبوتر کا بیان کئی جہتوں سے ہوا ہے۔ کبوتر بازی اور بٹیر بازی ایک زمانے میں ایک دلچسپ شغل تھا۔ ان کے کئی اقسام جیسے لقوئی، شیرازی وغیرہ ہیں۔ انہیں کابکوں میں پالنا شرفا کا کام تھا۔ نور جہان سے جو واقعہ کبوتر کو اڑا دینے سے متعلق ہے، وہ شہزادہ سلیم کے عشق کی داستان کا ایک باب ہے۔ دونوں حرم شریف میں کبوتروں کا مسکن ہے اور انہیں کھلانے کے لئے غریب عورتیں دانہ فروخت کرتی رہتی ہیں۔ یہی ان کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ مشاعرہ کی تفصیل میں کئی اشعار غلط چھپ گئے ہیں۔ میرا شعر بھی غلطی کا شکار ہوگیا۔ اسے یوں ہونا چاہئے تھا۔

مجھے پتہ ہی نہیں میرے لمس میں کیا ہے
کہ میرے ہاتھ میں آتے ہی بولتی ہے کتاب

بھائی فردوس گیاوی نے اپنی نظم میں ''پھر تری یاد دبے پاؤں چلی آئی ہے'' کے ساتھ دوسرا مصرع ''تم جو ہوتی تو کچھ اور ہی منظر ہوتا'' لکھ کر شتر گربہ کا عیب ڈال دیا۔ تم جو ہوتی بھی محل نظر ہے، ''تو'' لکھا جاتا تو یہ عیب بھی دور ہو جاتا۔

ارمان نجمی، پٹنہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زر سالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

PDF Compressor Free Version

بچوں کا
زبان وادب

☆	پین کو ڈ کیا ہے؟	نذیر احمد یوسفی	۷۴
☆	پڑھ لکھ کر اقبال بنو تم	مشتاق جاوید	۷۵
☆	بچوں کے نام	شمیم یوسفی	۷۵
☆	بھولکڑ بھولا	ڈاکٹر ہندراج بلوانی	۷۶
☆	قصہ ایک بھیڑیے کا	شائستہ فاطمہ	۷۸
☆	علم	تحسین روزی	۷۹
☆	دعائے خالص	حافظ محمد تمنا	۷۹
☆	ڈاکو کی اصلاح	سیماب منظر	۸۰

PDF Compressor Free Version

نذیر احمد یوسفی

"Urdu Darbar" Rahmania School Street, Asansol 713302

پن کوڈ کیا ہے؟

زمانہ قدیم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ خبر پہونچانے میں بڑی دقتیں پیش آتی تھیں۔ ایک خاص آدمی اس کے لئے سفر کرتا تھا، سواری کے لئے گھوڑے ہوتے تھے، دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں یہ سفر ختم ہوتا تھا اور اس طرح خبر کو اپنے اصلی مقام تک پہنچتے پہنچتے کافی تاخیر ہوجاتی تھی، جنگلوں، بیابانوں اور غیر محفوظ راستوں سے گزرتے وقت جان جانے کا خطرہ بھی رہا کرتا تھا۔

شیر شاہ نے پہلے پختہ راستے بنائے، پھر گھوڑوں کے رکھنے اور کھانے پینے کی سہولت کے ساتھ خبر لے جانے والے ہرکارے کے آرام کے لئے سرائے بھی بنوائی اس سے خبروں کو جلدی پہنچانے کا پہلے سے کسی قدر آسان طریقہ رائج ہوگیا۔ جدید ٹکنالوجی کے اس دور میں ترقی کے ساتھ ساتھ خبر رسانی کے طریقوں میں بھی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

انگریزی دور حکومت میں ٹیلی گرام کی ٹکل ٹکل نے ہفتوں کے کام گھنٹوں میں کرنے کی آسانیاں فراہم کی تھیں، لیکن اب تو زمانہ اس سے بھی آگے نکل چکا ہے موبائیل اور فون سسٹم سے گویا دنیا مٹھی میں آگئی ہے۔

وقت جیسی قیمتی شئے کو بچانے کے لئے، محکمہ ڈاک وتار نے ہمارے لئے اور بھی آسانیاں فراہم کردی ہیں۔ بس انہیں معقول طریقے سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ چند سال قبل محکمہ ڈاک وتار نے پن کوڈ کی سہولت رائج کی ہے۔

''پن کوڈ'' انگریزی لفظ ہے جسے پوسٹل انڈیکس نمبر کے بطور استعمال کیا جاتا ہے۔

پن کوڈ کے بٹوارے کے لئے ملک کے سارے صوبوں کو آٹھ حصوں میں بانٹا گیا ہے اور سبھی حصوں کی الگ الگ اکائیاں مقرر کی گئی ہیں، ہر صوبہ کے ضلعوں کے ڈاک گھروں کو مقررہ گنتی کے نشان دیئے گئے ہیں اور یہ سب چھ ہندسوں میں ہیں۔

دہلی، ہریانہ، پنجاب، چنڈی گڈھ، کشمیر اور ہماچل پردیش، یہ چھ علاقے نمبر ون (۱) انڈیکس میں آتے ہیں، اتر پردیش وہ واحد صوبہ ہے جو نمبر ٹو (۲) انڈیکس میں آتا ہے۔ نمبر تھری (۳) انڈیکس میں گجرات، راجستھان، دادر نگر اور دمن کا شمار ہے۔ نمبر فور (۴) انڈیکس میں، مدھیہ پردیش، چھتیس گڈھ، مہاراشٹر اور گوا آتے ہیں، نمبر فائیو (۵) میں کرناٹک اور آندھرا پردیش شامل ہیں۔ نمبر سکس (۶) تامل ناڈو، لکش دیپ اور کیرالا کو ملا ہے، اس کے بعد انڈیکس نمبر سیون (۷) ہے جو پورے دس علاقوں کے لئے ہے، ان میں بنگال، اڑیشہ، اروناچل، آسام، منی پور، ناگالینڈ، تری پورہ، میزورم اور انڈومان نکوبار ہیں۔ آخری نمبر (۸) جھارکھنڈ اور بہار کے حصے میں آیا ہے۔

پورے ملک کے آٹھ صوبوں کے لئے الگ الگ نمبر ہیں ان میں صفر بھی شامل ہے، پہلا ہندسہ صوبے کا اور اس کے بعد دو ہندسے ضلع کے اور آخری کے تین حصے ڈاک گھر کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اپنے شہر آسنسول کو لیتے ہیں، پہلا ہندسہ صوبہ کا ہے یعنی (۷) اور اس کے بعد دو ہندسے یعنی (۱۳) ضلع کے اور آخری کے تین ہندسے یعنی (۳۰۲) ڈاک گھر کے۔ اس طرح کل ''چھ ہندسے ہوئے'' پن کوڈ خطوط پر لکھے جانے سے وہ تمام خطوط مناسب جگہ اور مناسب وقت پر پہنچ جائیں گے آپ نے ضلع یا صوبہ کا نام نہیں بھی لکھا ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

مشتاق جاوید
P-121, Khansama Para, Matiaburj
Kolkata 700024 (Mob. 09088105567)

پڑھ لکھ کر اقبال بنو تم

ننھے منے پیارے بچو
نیل گگن کے تارے بچو
جان ہو دادا دادی کی تم
شان ہو نانا نانی کی تم
جس دم تم مکتب جاتے ہو
اچھے بچے کہلاتے ہو
امی تم کو بہلاتی ہیں
باجی کپڑے پہناتی ہیں
علم بڑی دولت ہے بچو
اس کی عظمت کو تم سمجھو
علم سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے
علم کی دنیا سب سے حسیں ہے
علم ہمیں طوفاں سے بچائے
علم ہی بیڑا پار لگائے
جو کرتا ہے علم کو حاصل
اُس کو ہی ملتی ہے منزل
ہے جاوید کی بس یہ تمنا
اس کی باتیں غور سے سننا
پڑھ لکھ کر اقبال بنو تم
جگ میں اُونچا نام کرو تم

شمیم یوسفی
Mohalla Qazi Tola, Near Sarai Masjid,
P.o. Ara 802301 (Bhojpur) (Mob.8986002183)

بچوں کے نام

مرے دل کی تمنا ہو ، مرا ارمان ہو بچو
تمہیں رستہ دکھاتا ہوں کہ تم انجان ہو بچو
تمہارے پاس انٹرنیٹ ، کمپیوٹر کی دنیا ہے
تم اپنے عہد کی گویا نئی پہچان ہو بچو
تم ہی سے اپنی امیدیں لگائے لوگ بیٹھے ہیں
تم اپنے وقت کا شاید نیا فرمان ہو بچو
غریبوں اور مجبوروں کو تم سے آس ہے کتنی
سہارا ان کا بن جاؤ تو یہ احسان ہو بچو
جہاں ہم لوگ رہتے ہیں ، وہاں کتنا اندھیرا ہے
اندھیروں کو مٹانا ہی تمہاری شان ہو بچو
دعا اب تو یہی دل سے نکلتی ہے کہ تم میں بھی
وہی گاندھی ، وہی آزاد جیسی آن ہو بچو
تمہارے دامن دل میں سمٹ آئے گی خود دنیا
کہ تم آدھا نہیں ہو ، پورا ہندوستان ہو بچو

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر ہندراج بلوانی

172, Maharathi Society, Sardarnagar, Ahmedabad 382475

بھولکڑ بھولا

بھولا نام کا ایک لڑکا تھا۔ وہ بہت ہی بھولکڑ تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ جانا ہوتا اسکول اور پہنچ جاتا دوست کے گھر۔ اس سے کیلے منگواتے تو بیگن لے آتا، یہاں تک کہ اسے مدرس کا دیا ہوا ہوم ورک بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ ایک دن ممی نے کہا: ''بیٹا بھولا بھرت بھائی کی دکان سے دو تین چیزیں منگوانی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں ابھی دوڑ کر لے آیا۔'' ممی بولی:

''کاغذ لاؤ میں تمہیں چیزوں کے نام لکھ دوں۔''

''ممی لکھنے کی کیا ضرورت ۔ میں چھوٹا تو ہوں نہیں، مجھے سب یاد رہے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''کون کہتا ہے تم چھوٹے ہو؟ تم چھوٹے تو نہیں، لیکن بھولکڑ ضرور ہو تمہیں کہاں کچھ یاد رہتا ہے؟ لکھا ہوا ہوگا تو پھر تمہیں یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

بھولا کو یہ بات ناگوار گزری، لیکن ممی کے سامنے زیادہ کیا بولتا۔ ممی نے ایک کاغذ میں چیزوں کے نام لکھ دیے۔ ۵۰ گرام الائچی، نمک کی تھیلی، دو ناریل۔

بھولا نے کاغذ پڑھا: ''بس! صرف تین چیزیں؟''

تھیلی اور کاغذ لے کر بھولا گھر سے روانہ ہوا۔ بھرت بھائی کی دکان کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا:

''ممی بھی عجیب ہیں۔ صرف تین چیزیں بھی کاغذ میں لکھ کر دیں۔ کیا اتنی چیزیں میں یاد نہیں رکھ سکتا۔''

اس نے جیب سے کاغذ نکال کر پڑھا۔ ''۵۰ گرام الائچی، نمک کی تھیلی، دو ناریل۔'' وہ کہنے لگا:

''بس یہ تین چیزیں، تو پھر اس کاغذ کی کیا ضرورت۔ آج میں ممی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ کاغذ کے بغیر بھی مجھے سب کچھ یاد رہتا ہے۔''

اس خیال سے اس نے کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ تینوں چیزوں کے نام رٹتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ راستے میں اس کی ملاقات سمیر سے ہوئی۔ اس نے پوچھا:

''بھولا کہاں جا رہے ہو؟''

''بھرت بھائی کی دکان پر جا رہا ہوں، ممی نے دو تین چیزیں منگوائی ہیں۔'' سمیر نے کہا:

''میرے پاس ویڈیو گیم لائے ہیں، دیکھنا چاہو گے؟''

''ہاں، ہاں بھلا کیوں نہیں؟ کہاں ہے؟ مجھے بتایئے نا!''

''وہ تو گھر پر ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو تمہیں میرے گھر چلنا پڑے گا۔''

اب بھولا سمیر کے ساتھ روانہ ہوا۔ سمیر کے گھر پر دونوں دیر تک گیم کھیلتے رہے۔ دونوں کو وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔ اچانک گھر کے باہر سے مداری کی ڈگڈگی کی آواز سنائی دی۔ دونوں ویڈیو گیم وہیں چھوڑ کر باہر کی طرف دوڑے۔ مداری کے پاس بندر تھا۔ مداری کے چاروں طرف بچے اکٹھا ہو گئے تھے۔

مداری نے نئے نئے کھیل دکھانے شروع کیے۔ بچے خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ جب مداری اپنا کھیل ختم کر کے وہاں سے روانہ ہونے لگا۔ تب بھولا کو خیال آیا کہ اسے کہیں جانا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ آج وہ نانی کے گھر جانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔

بھرت بھائی کی دکان سے خریدی جانے والی چیزوں کی بات اس کے ذہن سے نکل چکی تھی۔ اب وہ نانی کے گھر کی طرف دوڑا۔

PDF Compressor Free Version

نانی کے گھر پہنچ کر دیکھا تو گھر بند! بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ بھولا سوچنے لگا آج نانی کہاں گئی ہوں گی؟ کچھ دیر وہاں ٹھہرا، لیکن نانی نہیں آئیں۔ آخر کار مایوس ہو کر اس نے گھر لوٹنے کا ارادہ کر لیا۔ گھر لوٹتے وقت بازار کے نکڑ پر اسے یاد آیا کہ اسے کچھ خریدنا تھا۔ کیا خریدنا تھا؟ یاد کرنے کی کوشش کے باوجود اسے کامیابی نہیں ملی۔

اچانک اس کی نگاہ بھرت بھائی کی دکان پر پڑی۔ اسی وقت اسے یاد آیا کہ اسے دو تین چیزیں خریدنی تھیں، لیکن کون سی چیزیں؟ اسے اس بات پر بھی افسوس ہونے لگا کہ اس نے کاغذ ناحق پھاڑ دیا۔ اگر کاغذ ہوتا تو یہ تکلیف نہ ہوتی۔ ذہن پر زور دینے پر اسے رفتہ رفتہ سب یاد آنے لگا۔ اب وہ بھرت بھائی کی دکان پر پہنچا۔ بھرت بھائی نے بڑے پیار سے پوچھا:

''بیٹا بھولا، کیا چاہیے؟''

''ممی نے دو تین چیزیں منگوائی ہیں۔''

''کون کون سی نام بتاؤ؟''

''۵۰ گرام ناریل، ایک الائچی کی تھیلی، و نمک'' یہ سن کر بھرت بھائی ہنس پڑے اور بولے:

''بیٹا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

بھولا کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آخر اس سے غلطی کہاں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا:

''ہاں انکل، ممی نے تو یہی چیزیں لانے کو کہا ہے۔''

بھرت بھائی بولے:

''بیٹا، کچھ گڑبڑ معلوم ہو رہی ہے۔ دوڑ کر جاؤ اور ممی سے دوبارہ پوچھ کر آؤ۔''

بھرت بھائی کے اتنا کہنے کے باوجود بھولا کو اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا اور وہ گھر کی طرف لوٹا۔

ممی نے پوچھا:

''اتنی دیر کیوں ہوئی؟'' بھولا نے کہا:

''دیر کہاں ہوئی ہے ممی!''

''اتنی دیر سے لوٹے ہو اور کہہ رہے ہو کہ دیر کہاں ہوئی؟ خیر بتاؤ وہ چیزیں لائے؟''

''وہ تو بھرت انکل نے دی ہی نہیں۔''

''کیوں؟''

''مجھے کیا پتا، وہ تو کہہ رہے تھے کہ گھر جا کر اپنی ممی سے دوبارہ پوچھ کر آؤ۔''

''تم نے ان سے کیا مانگا تھا؟ اور وہ کاغذ کہاں ہے؟

''وہ کاغذ تو میں نے پھاڑ کر پھینک دیا۔''

''کیوں؟''

''مجھے سب کچھ یاد تھا، پھر کاغذ رکھنے کی کیا ضرورت؟''

ممی نے پوچھا:

''خیر تم نے ان سے کیا کیا مانگا تھا؟''

''۵۰ گرام نمک، ناریل کی تھیلی، دو الائچی''

ممی نے جب سنا تو زور زور سے ہنسنے لگیں، لیکن بھولا کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ممی اس طرح کیوں ہنس رہی تھیں۔ ممی نے پوچھا:

''اچھا یہ بتاؤ تمہیں آنے میں اتنی دیر کیوں ہوئی؟''

''میں تو نانی کے گھر گیا تھا، پر وہ تو تھیں ہی نہیں۔''

''کہاں سے ہوں گی۔'' ممی بولیں۔

''نانی تو دو روز سے ہمارے یہاں ہیں، یہ بھی بھول گئے۔''

بھولا ممی کے سامنے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

کام کی باتیں

☆ بدلہ لینے سے بہتر ہے کہ دل سے معاف کر دیا جائے

☆ دوسروں کو اکثر معاف کر دیا کرو، مگر اپنے آپ کو نہیں

☆ زندگی برف کی طرح ہے اسے نیک کاموں میں گزارو، ورنہ وہ پگھل تو رہی ہے ختم بھی ہو جائے گی۔

☆ بے حیائی اور بے شرمی تمام برائیوں کی جڑ ہے

☆ مال کا پھل سخاوت ہے اور علم کا پھل حلم

☆ اصل دین اور عبادت یہ ہے کہ انسان، انسان کے کام آئے

☆ شکر حصول نعمت کا باعث ہے اور ناشکری حصول زحمت کا

PDF Compressor Free Version

اشائستہ فاطمہ

4 No. Thokar, Near Muqadas Girls School, Flat No. I-16, Abu Fazl, okhla, New Delhi

قصہ ایک بھیڑیے کا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چاندنی رات میں ایک دبلے پتلے، سوکھے مارے بھوکے بھیڑیے کی ایک خوب کھائے پیے موٹے تازے کتے سے ملاقات ہوئی۔ دعا سلام کے بعد بھیڑیے نے اس سے پوچھا:

''اے یار! تو تو خوب موٹا تازہ دکھائی دیتا ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ میں نے تجھ سے زیادہ موٹا تازہ جانور آج تک نہیں دیکھا۔ بھائی یہ تو بتا کہ اس کا کیا راز ہے؟ میں تجھ سے دس گنا زیادہ محنت کرتا ہوں اور اس کے باوجود بھوکوں مرتا ہوں۔''

کتا یہ سن کر خوش ہوا اور اس نے بے نیازی سے جواب دیا:

''اے یار! اگر تو بھی میری طرح سے کرے تو مجھے یقین ہے کہ تو بھی میری طرح خوش رہے گا۔''

''بھائی جلدی بتا، وہ کیا بات ہے؟''

''تو بھی میری طرح رات کو گھر کی چوکیداری کر اور چوروں کو گھر میں نہ گھسنے دے۔ بس یہی کام ہے۔''

''بھائی! میں دل و جان سے یہ کام کروں گا۔ اس وقت میری حالت بہت تنگ ہے۔ میں ہر روز کھانے کی تلاش میں سارے جنگل میں حیران و پریشان مارا مارا پھرتا ہوں۔ بارش، پالے اور برف باری کے صدمے اٹھاتا ہوں، پھر بھی پیٹ پوری طرح نہیں بھرتا۔ اگر تیری طرح مجھے بھی گرم گھر رہنے کو اور پیٹ بھر کھانے کو ملے تو میرے لئے اس سے بہتر اور کیا بات ہے۔''

''تو پھر جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، غور سے سن اور اب تو فکر مت کر۔ بس میرے ساتھ چلا چل۔''

یہ سن کر بھیڑیا کتے کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی گئے تھے کہ بھیڑیے کی نظر کتے کے گلے پر پڑے ہوئے اس چوڑے گہرے نشان پر پڑی جو گلے کے پٹے سے پڑ گیا تھا۔ بھیڑیے نے پوچھا: ''اے یار! تیرے گلے کے چاروں طرف یہ نشان کیسا ہے؟''

''کچھ نہیں.....''

''اے یار! بتا تو سہی یہ نشان کیسا ہے؟''

''اگر تو اصرار کرتا ہے تو سن، میں چوں کہ درندہ صفت ہوں۔ دن کو میرے گلے میں پٹا ڈال کر وہ باندھ دیتے ہیں تاکہ میں سو رہوں اور کسی کو نہ کاٹوں اور رات کو پٹا کھول کر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ میں چوکیداری کروں اور جدھر میرا دل چاہے جاؤں۔ رات کو کھانے کے بعد میرا مالک ہڈیوں اور گوشت سے تیار کیا ہوا راتب اور بچوں سے جو ٹکڑا کھانا بچ جاتا ہے وہ سب میرے سامنے ڈال دیتا ہے۔ گھر کا ہر آدمی مجھ سے پیار کرتا ہے۔ جمع خاطر رکھ یہی سلوک، جو میرے ساتھ کیا جاتا ہے، وہی تیرے ساتھ ہوگا۔''

یہ سن کر بھیڑیا رک گیا۔ کتے نے کہا:

''چلو یار! کیا سوچتے ہو۔''

''اے یار! مجھے تو بس معاف کر۔ یہ خوشی اور آرام تجھے ہی مبارک ہو۔ میرے لیے تو آزادی ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ جیسا تو نے بتایا اس طرح اگر کوئی مجھے بادشاہ بھی بنا دے تو مجھے قبول نہیں۔''

یہ کہہ کر بھیڑیا پلٹا اور دوڑتا ہوا جنگل کی طرف چل دیا۔

☆ سچ بولنا لازم کرلو، کیونکہ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کا راستہ دکھاتی ہے۔

☆ جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ ایمان کا مخالف ہے۔

☆ احسان یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ بھی بھلائی کرو جو تمہارے ساتھ بدسلوکی کرے

PDF Compressor Free Version

تحسین روزی
Sultanganj, Patna 800006

علم

علم سے انسان کو آتا ہے جینے کا شعور
علم کی ہی روشنی سے ساری دنیا میں ہے نور
علم ہی سے اپنی مشکل منزلوں کو پاؤ گے
ورنہ ہر رستے میں بچو! ٹھوکریں ہی کھاؤ گے
علم ہی رہبر تمہارا ، علم ہی ہے روشنی
زندگانی کے سفر میں علم سے ہے ہر خوشی
علم والوں کا جہاں میں بول بالا ہو گیا
چھٹ گئی تاریکیاں ہر سو اُجالا ہوگیا
ظلمتوں کو دور رکھتی ہیں ضیائیں علم کی
اس لئے ہے لازمی شمعیں جلائیں علم کی
علم ہی کا ہر جگہ چرچا رہے تو خوب ہے
علم ہی کا بس دیا جلتا رہے تو خوب ہے

حافظ محمد تمنا
سنگی مسجد روڈ، پھلواری شریف، پٹنہ

دعائے خالص

خدا یا تو کردے مسلمان خالص
میرے دل میں بھر دے تو ایمان خالص
نہ ہوگی کبھی کوئی ترمیم اس میں
ہمیشہ پڑھیں لوگ قرآن خالص
کرے بندگی تیری ہر عضو میرا
مرے جسم میں ہو مری جان خالص
کوئی فرق پڑنے نہ پائے کبھی بھی
میسر ہو ہم سب کو ایمان خالص
کسی کی کوئی اس میں شرکت نہیں ہے
میرے رب کا مجھ پہ ہے احسان خالص
پڑھیں صدق دل سے ہم اس کو تمنا
کہ ہیں اس میں رحمت کے سامان خالص

PDF Compressor Free Version

سیماب منظر

Vill.+P.o. Reorha, P.s. Jalley, Dist. Darbhanga 847302

ڈاکو کی اصلاح

بچو! آج تمہیں ایک عبرت بھری کہانی سناتی ہوں۔ایک بار ڈاکوؤں کے ایک قافلہ کا گزر ایک جنگل سے ہوا۔ جب یہ لوگ آدھے جنگل میں پہنچے تو دیکھا ہے کہ ایک پیڑ کے قریب زمین پر ایک ضعیف انسان بیٹھا ہوا خاموشی سے کچھ پڑھ رہا ہے اور اس کے سامنے ایک گٹھری رکھی ہوئی ہے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے زور سے آواز لگائی:

''اے بوڑھے یہاں تنہا تم کیا کر رہے ہو؟ بھلا تمہیں یہاں کیا ملے گا۔''

''تم جیسے پیارے لوگ اور سکون۔''

''مگر اس گٹھری میں کیا ہے؟''

''تمہارے کام کی چیز نہیں، تم جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔''

لیکن وہ لوگ نہیں مانے اور گٹھری چھین لی۔

دیکھو، اس میں میری اچھی اچھی کتابیں ہیں۔تم مجھے واپس کردو اس سے میں دوسروں کی اور دین کی خدمت و اصلاح کرتا ہوں۔''

لیکن سردار نے ایک نہ مانی اور لے کر اسے جانے لگا تو ضعیف نے کہا:

''بیٹے میری ایک بات مانو گے۔''

سردار نے جواب دیا:

''بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تم ساری کتابوں کو پڑھنا اور خود نہ پڑھ سکو تو کسی سے پڑھوا کر ضرور سننا اور اس پر عمل کرنا، شاید تمہارا بھلا ہو جائے۔''

سردار نے ساری باتیں سنیں، مگر اسے کچھ رحم نہ آیا اور کتابوں کی گٹھری لے کر روانہ ہوا کہ کہیں بیچ کر کچھ پیسے حاصل کرلیں گے۔ جب وہ جنگل پار کر کے گاؤں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا، بالکل ویسا ہی بوڑھا ایک پیڑ کے قریب بیٹھا ہے، سردار اسے دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا اور کہنے لگا:

''اے بوڑھے تم کیا کر رہے ہو؟''

تمہارا انتظار، تم لوگ ڈاکو ہو؟''

''ہاں.....''

''لیکن میں تو دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بھلے اور اچھے انسان ہو، جو دینی کتابوں کی تجارت کرتے ہو اور لمبے سفر کی تکلیفیں جھیل کر یہ خدمت کرنے نکلے ہو، جاؤ میری دعائیں تم لوگوں کے ساتھ ہیں، ایک دن تم لوگوں کو منزل ضرور ملے گی۔''

یہ ساری باتیں سنتا ہوا قافلہ آگے نکل گیا، مگر سردار کی بے کلی بڑھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کوئی مجھے پڑھ کر سنائے کہ ان کتابوں میں کیا کیا لکھا ہے، اس میں ایک پڑھا لکھا ڈاکو بھی تھا اس نے پڑھ کر خلاصہ سنایا کہ ان کتابوں میں یہ تاکید ہے کہ اپنی برائی سے توبہ کرلینا، دوسروں کے ساتھ ظلم و زیادتی سے باز آنا، غیروں کے مال و اسباب کو زبردستی مت لوٹنا اور ان کتابوں کو دوسروں کو دے دینا، اس تاکید کے ساتھ کہ وہ بھی اس پر عمل کریں۔''

سردار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور پورے قافلے کے ساتھ پلٹ کر اس بزرگ کے پاس آیا اور معافی مانگی۔ بزرگ نے کہا:

''بیٹے ہم نے تم لوگوں کو دل سے معاف کیا، انشاءاللہ وہاں بھی تمہاری معافی قبول ہوگی اور میری ایک بات سن لو۔ میں بھی ایک بے رحم ڈاکو تھا، میں نے بھی اسی طرح ایک شخص کی کتابیں لوٹا تھا، مگر اس کی تاکید کے مطابق کتابیں پڑھیں تو میری اصلاح ہوگئی اور اس دن سے یہی خدمت کرتا آرہا ہوں۔